صلی اللہ علیہ وسلم
میرے سرکار
راجا رشید محمود
اختر کتاب گھر

صلی اللہ علیہ وسلم

میرے سرکار

★

راجا رشید محمود

★

اختر کتاب گھر

اظہر منزل، نیو شالامار کالونی، ملتان روڈ۔ لاہور ۲۵

کتاب: میرے سرکار (صلی اللہ علیہ وسلم)
موضوع: سیرت و محبتِ مصطفیٰ (علیہ التحیۃ والثنا)
مصنف: راجا رشید محمود (ایم اے۔ فاضل درسِ نظامی)
صفحات: ۱۴۴
اشاعت اول: ۱۹۸۷ء
مطبع:
کتابت: محمد انور، کاموکے
ناشرین: اظہر محمود، اختر محمود

★

اختر کتاب گھر

اظہر منزل، نیو شالامار کالونی، ملتان روڈ — لاہور ۲۵

قیمت ۱۸ روپے

اپنی بیگم

نسرین اختر

کے نام

جو اٹھتے بیٹھتے سرکار (صلی اللہ علیہ وسلم) کو پکارتی رہتی ہیں

بارہ برس ہوئے ہیں کہ اک حادثہ ہوا
وہ حادثہ حیات کا میری ہے خاص موڑ
وہ دن تھا اور آج کا دن، وقفِ نعت ہوں
غیرِ رسولِ پاکؐ سے ناتا لیا ہے توڑ

◎

فہرست

★★

جس کے لبوں پہ ذکرِ نبیؐ کی مٹھاس ہے
اُس کو ہوائے گلشنِ فردوس راس ہے
جو خوش نصیب پیروِ حسانؓ و کعبؓ ہوا
وہ شخص بے نیازِ الم، بے ہراس ہے
ذکرِ حضورؐ، یادِ مدینہ، غمِ فراق
ان واسطوں سے آج طبیعت اُداس ہے
اُن کے بغیر ہوگی خدا تک رسائی کیا!
حق آشنا ہے وہ، جو پیمبرؐ شناس ہے
مل جائے گا مجھے دلِ گم گشتہ کا سراغ!
طیبہ میں ہے یا اُس کے کہیں آس پاس ہے
کیونکر نہ میرا غنچۂ دل عطر بیز ہو!
اس میں رچی بسی جو مدینے کی باس ہے
نومیدیٔ زیارتِ طیبہ ہے وجہِ موت
زندہ ہوں اس لیے کہ مجھے اب بھی آس ہے
مختارِ دو جہاںؐ سے جو مانگو گے، پاؤ گے!
جو کچھ خدا کا ہے، وہ پیمبرؐ کے پاس ہے
اس سے زیادہ اور ہو کیا وجہِ افتخار،
محمودؔ اُن کے داسوں کے داسوں کا داس ہے

سرکار صلے اللہ علیہ وسلم کا مولودِ مسعود

۱۲ ربیع الاوّل یومِ ولادت ہے سرکارِ دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم کا۔ اس روزِ سعید پر ہم مسرت و ابتہاج کا اظہار کرتے ہیں۔ سرکارؐ کے علوِ مرتبت اور ان کی سیرت کے افکار سے اپنی محفلوں سے لے کر دلوں تک کو منور کرتے ہیں۔ دنیا کے تمام مسلمان اس دن خوشیاں مناتے ہیں، حضورِ پُرنور صلے اللہ علیہ وسلم کی نعت کی زمزمہ پیرائیوں سے رُوح و جان میں عقیدت و ارادت کی بارانِ رحمت ہوتی ہے۔ قصبے قصبے، قریے قریے میں، گھر گھر میں کائنات کے آقا و مولا محمد مصطفےٰ علیہ التحیۃ والثناء کی ولادت باسعادت کے تذکرے ہوتے ہیں، حضور کی محبت کے مظاہر ہوتے ہیں، ان سے عقیدت کا اظہار ہوتا ہے، ان کے ارشادات پر عمل کی اہمیت بیان کی جاتی ہے۔ اس دن، بلکہ اس پُورے مہینے میں ہر آدمی اپنے آقاؐ کی ثنا میں رطب اللسان نظر آتا ہے اور نظم و نثر میں حضورؐ کی نعت پڑھتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ عمل کیسا ہے، اس کا کیا جواز ہے؟

سرورِ کائنات فخرِ موجودات علیہ السلام والصلوٰۃ کی نعت کے جن پہلوؤں کا اظہار ہم اُمتیوں سے ہوتا ہے، اس کا آغاز کب ہوا؟ سرکارؐ کی مدحت کس کی سُنت ہے۔ خداوندِ قدوس و کریم نے اپنے حبیب پاک صاحبِ لولاکؐ کے بارے میں اُمّ الکتاب میں کیا کچھ فرمایا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے سورۂ آلِ عمران کو دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کتاب و حکمت سکھانے اور لوگوں کو پاک فرمانے والے رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی بعثت کو اہلِ ایمان پر اپنا احسان گردانتا ہے، پھر ہم اس احسان پر اپنے محسن کا شکریہ کیوں نہ ادا کریں اور خدا ہی کے حکم کے مطابق تحدیثِ نعمت کے طور پر اپنے محبوب، کائنات کے محبوب، خالق کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف و ثنا میں تر زبانی سے کیسے باز رہیں۔

غالب نے کہا تھا

ہر کس قسم بدانچہ عزیز است ، می خورد
سوگند کردار بجان محمدؐ است

میں نے بھی غالب سے اس صورت میں استفادہ کیا ہے :

قسم اس چیز کی کھاتے ہیں جو ہر شے سے پیاری ہو
تو پھر خالق نہ کھاتا آپ کی جاں کی قسم کیونکر!!

مگر اللہ کریم نے صرف سورۂ حجر میں "لعمرک" کہہ کر محبوبؐ کی جان کی قسم پر اکتفا نہیں کیا ، اسے حضورؐ کی ہر چیز پیاری ہے۔ چنانچہ اس نے سورۂ بلد میں اس شہر کی بھی قسم کھائی ہے جس میں اس کے محبوبؐ تشریف فرما ہیں۔ پھر اس نے حضورؐ کے باپ (حضرت ابراہیم علیہ السلام) کی قسم کھائی اور ساتھ ہی حضرت ابراہیمؑ کی اولاد (یعنی رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم) کی قسم کھائی۔ سبحان اللہ کیا انداز ہے۔ پھر پھر کر بات اس کے محبوبؐ ہی تک آتی ہے۔ سورۂ نساء کو دیکھئے۔ اللہ جل شانہٗ اپنی قسم کھائی ہو تو بھی "اپنے محبوب کے رب کی قسم کھاتا ہے۔ کسی نے محبت کے انداز دیکھے ہیں!

خداوند کریم نے حضورؐ کو مبشر نذیر اور شاہد بناکر بھیجنے کا اعلان کیا ، تو ساتھ ہی اعلان کیا کہ اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لاؤ اور حضورؐ کی تعظیم و توقیر کی ہدایت کی۔ (سورہ الفتح) مقصد یہ ہے کہ اگر خدا اور رسولِ خدا (جل جلالہٗ و صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان لاؤ گے اور حضورؐ کی تعظیم و توقیر سے روگردانی کرو گے تو جہنم میں جلو گے۔ اور ساتھ ہی شاہد بناکر بھیجنے کا اعلان کیا کہ تم ایمان لانے ہو یا نہیں ، ان کی تعظیم و توقیر میں کوئی کمی تو نہیں کرتے ، حضورؐ اس کے گواہ ہیں۔

خالق و مالک نے سورہ الحجرات میں حضورؐ کی تعظیم کے ایک پہلو کی نشاندہی یوں کی ہے "اللہ ورسولؐ سے آگے نہ بڑھو ، اپنی آوازیں آقاؐ کی آواز سے اونچی نہ ہونے

دو ، ان کی بارگاہ میں چلا کر بات نہ کرو"۔ یعنی اگر کوئی اس کا مرتکب ہوگا تو وہ اللہ اور اس کے رسولؐ سے آگے بڑھنے کا مجرم ہوگا۔ اللہ اکبر!

سورۂ نور میں بھی یہی کہا گیا کہ جس طرح تم ایک دوسرے کو آپس میں پکارتے ہو ، اس طرح حضورؐ کو پکارنے کی جرأت نہ کرنا یعنی سرکارؐ تم جیسے نہیں ہیں ، ان کا ادب کرو ، ان کی تعظیم کو شعار کرلو کہ دین و دنیا کی بھلائی کا راز اسی میں مضمر ہے۔ سورہ بقرہ میں تو یہاں تک ہے کہ کوئی ایسا لفظ جس کو بگاڑ کر اس کے ایسے معنی نکالے جاسکتے ہوں جو حضورؐ کے مرتبے اور شان کے منافی ہوں یا اس سے فروتر ہوں ، اس لفظ کو ادا کرنے سے علماً روک دیا گیا ہے۔ منافقوں نے حضورؐ کو "راعنا یا رسول اللہ" کہا۔ راعنا کے معنی منافقت کی نظر میں "ہمارے چرواہے" کے تھے۔ اللہ نے حکم دیا کہ کوئی شخص اب حضور علیہ السلام کو اس لفظ سے مخاطب کرنے کی جسارت نہیں کرے گا۔ "انظرنا" کہے گا نظرِ کرم کی درخواست کرے گا۔ حضور علیہ السلام کی زندگی میں بھی اور بعد میں بھی کچھ لوگ انہیں "چرواہا" کہہ کر اپنی منافقت کی حس کو تسکین پہنچانے کی کوشش کرتے رہے۔ اللہ کریم نے اس آیت میں ایسے لوگوں کو کافر کہا ہے اور ان کے لیے عذابِ الیم کا اعلان کیا ہے۔

سورۂ الاحزاب میں خداوند تعالےٰ نے بتایا ہے کہ وہ اور اس کے فرشتے رسولِ کریم علیہ التحیۃ والتسلیم پر درود بھیجتے ہیں۔ پھر اس نے مومنوں کو حکم دیا کہ وہ بھی حضورؐ پر درود و سلام کے پھول نچھاور کریں۔ اگر کوئی شخص خدا کی اس بات کو نہیں مانتا ، یہ کہتا ہے کہ خدا کا حضورؐ پر درود بھیجنا کافی ہے ، وہی بھیجتا رہے ، وہ خدا کے حکم کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ سرکارؐ نے ایک جھگڑے کا فیصلہ حضرت زبیرؓ کے حق میں دیا تو دوسرے فریق کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ حضورؐ نے قرابت کی وجہ سے حضرت زبیرؓ کی رعایت کی ہے۔ اس پر اللہ تعالےٰ نے اپنے محبوبؐ کے رب کی قسم کھا کر کہا کہ آپس کے جھگڑے میں حضورؐ کو حکم نہ ماننے والے اور اپنے دلوں میں حضورؐ کے فیصلے کے بارے میں رکاوٹ پانے والے مسلمان نہیں ہیں۔ اسی صورت میں فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ اپنی جانوں پر ظلم کر بیٹھیں ، وہ اپنے آقاؐ کے حضور حاضر ہوں ، پھر اللہ سے

معافی مانگیں، پھر حضورؐ ان کی شفاعت کریں۔ یہ مراحل طے ہو گئے تو اللہ ضرور توبہ قبول فرمائے گا اور مہربانی فرمائے گا۔ یعنی مسلمانوں میں سے جو بھی غلطی کر بیٹھے، پہلے آقاؐ کی حضوری کی منازل طے کرے، پھر اللہ سے معافی مانگے اور سرکارؐ بھی ایسا چاہیں تو خدا اپنے رحیم اور توّاب ہونے کی صفات کا مظاہرہ کرے گا۔

آلِ عمران میں ہے کہ جو شخص اللہ سے محبت کرنے کا دعویدار ہو، وہ پہلے حضورؐ کا فرمانبردار ہو، ان کی اتباع کرے۔ اگر ایسا ہو گا تو اس کی محبت کی قبولیت یوں ہو گی کہ خدا اس کو دوست بنائے گا اور اس کے گناہ بخش دے گا —— ایک دفعہ آقاؐ غنیمت کا مال تقسیم فرما رہے تھے تو ایک شخص نے تقسیم میں عدل و انصاف کی یاددہانی کرائی۔ حضورؐ نے فرمایا کہ اگر میں بھی انصاف نہ کروں گا تو پھر دُنیا میں منصف کون ہوگا۔ اس پر سُورہ توبہ کی آیت نازل ہوئی جس میں کہا گیا کہ خدا اور اس کے رسولؐ کے دیئے پر راضی ہونا ہی اچھّا ہے اور اللہ اور اس کے رسولؐ کے دینے کو کافی سمجھنا چاہیئے۔

خداوندِ لایزال نے سُورہ مائدہ اور سُورہ نساء میں حضورؐ نورِ مجسم صلے اللہ علیہ وسلّم کی آمد کو نُور کی آمد فرمایا ہے۔ سورۂ انفال میں حضورؐ کی جنگِ بدر میں دُشمنوں کی طرف پھینکی ہوئی کنکریوں کی مٹھی کو اپنا فعل قرار دیا ہے۔ علامہ اقبالؒ مفہوم "عبدہٗ" کی وضاحت میں کئی شعر کہنے کے بعد اپنی بے بضاعتی کا اعلان کرتے ہوئے قرآن کی اسی سورت کی طرف راہنمائی کرتے ہیں کہ مفہومِ عبدہٗ کی وضاحت اسی مقام سے ہو سکتی ہے۔

مدعا پیدا نگردد زیں دو بیت
تا نہ بینی از مقامِ "مارمیت"

خدا تعالیٰ خود رؤف و رحیم ہے۔ اس نے سُورہ توبہ میں حضورؐ کو بھی "بالمومنین رؤف رحیم" کہا ہے۔ سُورہ انفال میں کہہ دیا ہے کہ جب تک حضورؐ مسلمانوں میں موجود ہیں، خدا انہیں عذاب نہیں دے گا۔ خالق خود ربّ العالمین ہے، اس نے اپنے محبوبؐ کو رحمۃ للعالمین کہا ہے (سُورۂ انبیاء) یعنی جن کو اللہ پالتا ہے، جن کا وہ

پروردگار ہے، رب ہے، ان کے لیے حضور رحمت للعالمین ہیں۔ حضورؐ نے صحابہ کرامؓ کو غزوۂ تبوک کے لیے چلنے کا حکم دیا تو بعض حضرات نے عرض کیا کہ ہم ماں باپ سے پوچھ لیں۔ اس پر وہ آیت نازل ہوئی جس میں کہا گیا تھا کہ حضورؐ تمہاری جانوں کے تم سے زیادہ مالک ہیں۔

سرکارِ دوعالم صلے اللہ علیہ وسلّم نے حضرت زید بن حارثہؓ کا پیغام اپنی پھوپھی زاد حضرت زینب بنت جحش کے لیے دیا۔ انہوں نے حضرت زیدؓ کے غلام ہونے کے باعث اور اپنے قریش ہونے کی وجہ سے یہ پیغام قبول نہ کیا تو سورۂ احزاب کی وہ آیت نازل ہوئی جس میں واضح کر دیا گیا کہ تمہاری جانوں یا مال یا کسی اور مسئلے میں جو کچھ اللہ اور رسولؐ حکم دیں، اس میں دخل دینے کا کسی کو حق نہیں، اس پر سر جھکانا ہی ایمان کی نشانی ہے یعنی مسلمانوں کی زندگیوں پر، ان کے حالات پر رسُولِ اکرمؐ مختار ہیں، جو چاہیں فیصلہ دیں۔

حضور پُرنور صلے اللہ علیہ وسلّم کے خُلق کو خُدا نے عظیم فرمایا ہے، حضورؐ کے ذکر کو بلند کرنے کا اعلان کیا ہے۔ خدا کے محبوبؐ نے چاہا کہ بیت المقدس کے بجائے کعبۃ اللہ دوبارہ قبلہ بن جائے اور چونکہ حضورؐ کی چاہت خُدا کے حکم کا درجہ اختیار کر لیتی تھی، انہوں نے بار بار آسمان کی طرف سرِ مُبارک اُٹھا کر دیکھنا شروع کیا کہ ابھی تک میری خواہش کو وحی کی شکل کیوں نہیں دی گئی تو اللہ عزّوجل نے فرمایا "ہم آپ کا بار بار آسمان کی طرف مُنہ کرنا دیکھ رہے ہیں۔ چنانچہ ابھی مُنہ مسجد حرام کی طرف پھیر لیں"۔

خُدا کی رضا چاہتے ہیں دو عالم
خُدا چاہتا ہے رضائے محمدؐ

منافقین اپنی مجلسوں میں محبوبِ کبریا علیہ التحیۃ والثناء پر طعن کیا کرتے تھے اور جب مُسلمانوں میں آتے تو اس سے انکار کرتے اور قسمیں کھا کھا کر اپنی برئیت کا اظہار کرتے۔ اس پر خدا نے کہا کہ مسلمانوں کے سامنے قسمیں کھا کھا کر انہیں راضی کرنے

والے منافقین کے لیے بہتر یہ تھا کہ خدا اور رسولِ خدا (جل جلالہٗ و صلی اللہ علیہ وسلم) کو راضی کرتے۔ کیونکہ ایمان والے تو خدا اور رسولؐ کو راضی کرنا چاہتے ہیں۔ پھر خدا نے فرمایا کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے مخالفوں کے لیے جہنم کی آگ تیار ہے اور یہی آگ ان کا مقدر ہے (توبہ) یہی حکم اللہ تبارک و تعالیٰ نے سورۂ نساء میں دیا ہے کہ حق کا راستہ واضح ہو جانے کے بعد مسلمانوں کی راہ سے، جدا ہو کر چلنے والا وہ ہے جو رسولؐ کا مخالف ہے، ان کے خلاف چلتا ہے، بارگاہِ مصطفےٰؐ سے راندہ ہوا ہے اور خدا اسے دوزخ میں داخل کرے گا۔ خدا نے اپنے محبوبؐ کے مخالفوں کو کہیں ہاتھ ٹوٹنے کے کوسنے دیئے ہیں (سورہ لہب) اور کہیں اُن کے "بعد ذالکَ زنیم" ہونے کا اعلان کیا ہے۔ (سورہ القلم)

اللہ کریم ہمیں اپنی سنّت پر عمل کرنے کی توفیق دے، یعنی ہم اس کے محبوبؐ کی نعت کہا کریں، ان کے ذکرِ پاک سے اپنی محفلوں کو پُر نور بنائیں۔ ان کی تعظیم و توقیر کریں، ان کے مخالفوں کے خلاف نبرد آزما ہیں۔ کہ یہ خدا کا حکم ہے، یہی اس کا عمل ہے اور یہی ایمان کی بنیاد ہے۔

عشقِ سرکار صلی اللہ علیہ وسلم اور تقلیدِ سیرت

انسانیت کی نیا تلاطمِ عصیان و کفر کے ہچکولوں کے حوالے تھی کہ محبوبِ کبریا علیہ التحیۃ والثنا نے اس کی ناخدائی کا بیڑا اُٹھایا۔ دُنیا غلبۂ نفس کا شکار تھی۔ زبردست کی شہنشاہی اور کمزور کی تباہی کے دن تھے۔ خالق و مالک خدائے لم یزل کے بجائے بے جان بتوں کو معبود بنا لیا گیا تھا، خواہشوں کو پُوجا جاتا تھا۔

عالمِ انسانیت وحشت و بربریت کا مرقع بن چکا تھا۔ عورتوں سے حقوقِ زندگی چھین لیے گئے تھے۔ غریبوں کی زندگی ان کے کندھوں کا بوجھ بن گئی تھی، شرک و بدعت کا دور دورہ تھا۔ حقوق العباد غصب کرنا "عظمتِ کردار" کی دلیل بن گیا تھا، جہالت کی تاریکیاں اذہان و قلوب پر چھا چکی تھیں۔ صداقت و ہدایت کے چشمے لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل تھے۔ ایسے میں خدائے وحدہٗ لاشریک نے ایک بے مثال ہستی کو دُنیائے آب و گِل میں بھیجا۔ وہ ہستی، جسے اس نے سب سے پہلے پیدا کیا تھا، جس کے لیے سب کچھ تخلیق کیا تھا۔ رُشد و ہدایت کا یہ سرچشمہ عرب کے شہر مکہ مکرمہ سے پھوٹا۔ کفر و الحاد کے جُبّے چھٹ گئے، توحید کا سورج طلوع ہوا۔ بدرالدجیٰ، نور الہدیٰ، علیہ التحیۃ والثنا کی آمد نے اس دُنیائے تیرہ و تار کو مطلعِ انوار بنا دیا۔

کائناتِ عالم میں ہدایت کا اصل ذریعہ انبیائے کرام ہیں۔ انہی سے صداقت کی کرنیں پھوٹتی اور دُنیا کو بقعۂ نور بناتی ہیں، انہی سے اخوت و مروت کی شمعیں جلتی ہیں اور بغض و کینہ و فساد کے اندھیرے گوشوں کو منور کرتی ہیں۔ انبیائے کرام میں سب سے زیادہ اہمیت ہمارے آقا و مولا کو ہے، جو امام الانبیاء ہیں کہ بیت المقدس میں تمام انبیائے کرام نے ان کی اقتدا میں نماز ادا کی۔

رسولؐ سارے نہ ان کے پیچھے نماز اقصیٰ میں کیوں کھڑے ہیں
کہ وہ بھی سرکارؐ کی بدولت وجود میں آئے تھے عدم سے

سرکار نبی الانبیا ہیں کہ اللہ تبارک وتعالےٰ نے تمام انبیا کی ارواح سے انکی نبوت کا حلف لیا تھا۔
"اور یاد کرو جب اللہ نے پیغمبروں سے ان کا عہد لیا، جو میں تم کو کتاب اور حکمت دوں، پھر تشریف لائے تمہارے پاس وہ رسولؐ جو کہ تمہاری کتابوں کی تصدیق فرمائے تو تم ضرور ضرور ان پر ایمان لانا اور ضرور ضرور ان کی مدد کرنا۔ فرمایا کیا تم نے اقرار کیا اور اس پر بھاری ذمّہ لیا۔ سب نے عرض کی، ہم نے اقرار کیا۔ تو فرمایا ایک دوسرے پر گواہ ہو جاؤ اور میں آپ تمہارے ساتھ گواہوں میں ہوں"

(سورہ آلِ عمران۔ آیت ۸۱-۸۲)

حضور صلے اللہ علیہ وسلّم محسن انسانیت ہیں۔ انہوں نے اپنے ابدی اُصولوں، سنہری ارشادات اور روشن کردار کے باعث انسانیت کو قعرِ مذلت کے عمق سے بامِ اوج وعظمت تک پہنچایا۔ وہ غریبوں کے حامی، غلاموں کے مولا اور بے کسوں کے دستگیر ہیں کہ انہوں نے زیر دستوں کو زبردستوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کی ہمت بخشی اور حوصلہ شکن حالات اور بہت کم عرصے میں انسانی مساوات کی ایسی تعلیم دی، جس کی تابانی و درخشانی کے سامنے غیر اسلامی نظام آنکھیں موندے دم سادھے پڑے ہیں۔ سرکارِ دو عالم صلے اللہ علیہ وسلّم مظلوموں کے خبر گیر اور بیواؤں، غریبوں، ناداروں کے پشت پناہ تھے، دُشمن بھی ان کی صداقت و امانت کے مدّاح و معترف رہے۔

جو تیری جان کے دُشمن تھے، وہ بھی کہتے تھے
امین تو ہے، صداقت کی آبرو تو ہے!

انسان کو حقیقی کامیابی وکامرانی اور فلاح وبہبود کا راستہ فخرِ موجودات علیہ السلام والصلوٰۃ نے سکھایا۔ غاروں کی تنہائیوں کو روشن کرنے والے نے دُنیا کے در و دیوار سے انسانوں کے دلوں تک کو تابندہ و درخشندہ کر دیا۔ ہم خدا کے تصوّر سے بیگانہ تھے، ہمیں سرکارؐ نے صداقتوں تک پہنچا دیا۔ ہم اپنے آپ سے ناواقف تھے،

ہمیں عرفانِ نفس دیا۔ ہم نفس کے دھوکے میں آگئے تھے، ہمارا تزکیہ کیا۔ ہماری رفتار میں وقار اور گفتگو میں سنجیدگی نہ تھی، ہمیں ان راہوں سے آشنا کیا۔

پہلے انسان انسان کا محتاج تھا، میرے آقاؐ نے اس احتیاج کے تصوّر تک کو مٹا کر انسان کو صرف خُدا کے در تک پہنچنے کی لگن لگائی۔ صاحبِ لولاک آقاؐ نے حرّیتِ فکر کی تشکیل کی، مساوات واخوّتِ انسانی کی تاسیس کی اور تخیّل وتصوّر کو تحت الثریٰ کی عمیق گہرائیوں سے افلاک تک پرواز کی تعلیم دی۔ آپ کی تشریف آوری سے پہلے آدمیت غلامی کی زنجیروں میں مقیّد ومحبوس تھی۔ آپ نے ہمیں وہ طریقِ نجات دیا، اس اسلوبِ زندگی کی تلقین کی جس میں انسانیت کی فلاح کا راز مضمر تھا، جس میں آزادیٔ فکر وخیال کی نوید تھی، احساس کی عظمت تھی۔ رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے بنی نوعِ انسان کی زنگ آلود صلاحیتوں کو اپنے اقوالِ زرّیں اور اعمالِ صالحہ سے صیقل کیا۔ انہوں نے ہر مُسلمان کو دوسرے مسلمان کا بھائی قرار دیا اور عالمِ ایجاد میں رنگ ونسل کے تمام امتیازات کو مٹا کر آدمی کو اتحاد و یگانگت کی راہ پر چلا دیا۔ انہوں نے تالیفِ قلوب کی، اخوت ومحبت کی غیر محسوس زنجیروں کو ذہن واحساس پر نافذ کر دیا۔ ملّت کو جسدِ واحد بنا دیا۔

حضور پُرنور صلے اللہ علیہ وسلّم انسانیت کے محسن ہیں کہ انسان کو انہوں نے دُنیوی فلاح اور اُخروی نجات کا راستہ دکھایا۔ آپؐ خالقِ کائنات کے محبوب اور ممدوح ہیں کہ قرآن مجید آپکی تعریف وثنا سے بھرا پڑا ہے۔ سرکارؐ میرے محسن ہیں کہ اگر وہ نہ ہوتے تو میں کہاں ہوتا۔ آپ خدا کے بندے ہیں، اسکے نبی اور رسُولؐ ہیں، اس کے محبوب ہیں، اس کے سوا باقی ہر چیز آپ کی مرہونِ منّت ہے، آپ کی مدّاح ہے، آپ کے عشق کا دم بھرتی ہے، کیونکہ اگر سرکار نہ ہوتے تو فرد کی تخلیق نہ ہوتی، معاشرہ نہ بنتا، ملک وجود میں نہ آتے، زمین وآسمان کا تصوّر موہوم ومعدوم ہوتا، کائنات معرضِ وجود میں نہ آتی، اُونٹ کی خلقت، آسمان کی رفعت کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ پہاڑ کیسے نصب ہوتے اور زمین کس طرح مسطوح ہوتی۔ خدا کا نام لیوا کون ہوتا۔ اس کی تسبیح وتحمید کون کرتا۔ یہ سب کچھ تو سرکار کے فیض سے ہے، ان کے وسیلے اور واسطے سے ہے۔ فخرِ موجودات سرورِ کائنات علیہ السلام والصلوٰۃ نہ ہوتے تو ربِ کریم اپنی الوہیت کو ظاہر نہ کرتا،

کائنات کو پیدا نہ کرتا۔

تاریخ کے صفحات پر بڑے بڑے باجبروت شہنشاہوں کے تذکرے بکھرے پڑے ہیں لیکن ان کی جبروت و عظمت نے سیدِ عالم صلے اللہ علیہ وسلم کے غلاموں کے قدموں میں پناہ تلاش کی، ان کی کشور کشائیوں کو حضورؐ کے نام لیواؤں نے اپنے پیروں تلے روند ڈالا اور قیصر و کسریٰ کے سر اُن لوگوں کے سامنے خم ہو گئے جو حضورؐ کے نام نامی کے احترام میں سر جھکا دیا کرتے تھے۔ جنگجوؤں نے دُنیا فتح کی تلوار کے زور سے اپنا لوہا منوایا، بڑے بڑے خطہ ہائے ارض پر حکومت کی مگر شاہِ اممؐ نے اپنے اخلاقِ عالیہ سے ہتھیاروں کے مُنہ پھیر دیئے، ذہنوں کو حق کی طرف راغب کیا اور دلوں پر حکمرانی فرمائی۔ انبیاء و رسل نے اپنے اپنے حیطۂ اختیار کے لوگوں کو صراطِ مستقیم دکھایا مگر نبی الانبیاء اور افضل الرسل کا پیغام عالمگیریت کا حامل ہے۔ انہیں خلقِ خدا کی رہبری اور رہنمائی کا فریضہ سونپا گیا تھا اور حضورؐ کے بعد نبوت و رسالت کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا گیا۔ حضورؐ صرف اپنی اُمت ہی کے لیے رؤف و رحیم نہیں، عالمین کے لیے رحمت ہیں، ان کی شفاعت صرف مسلمانوں ہی کے لیے نہیں، پہلے انبیاء اور ان کی اُمتوں کی بھی دستگیر ہے۔

اگر شہنشاہِ کونین کی معرفت نصیب نہ ہوتی تو طالبانِ حق حقیقت کو کیسے پاتے؟ اگر حضورؐ کا اسوۂ حسنہ رہنمائی نہ کرتا تو دُنیا و آخرت میں سرخروئی کس کو حاصل ہوتی؟ اگر آپ کی تعلیمات و ارشادات اور آپ کی سیرتِ پاک دستگیری نہ کرتی تو حیاتِ انسانی، تاریخِ عالم، تہذیب و تمدن اور معاشرت و مدنیت میں خوشگوار اور صحت مند انقلاب کیسے آتا، اگر آپ کے کردار و گفتار سے ہم مستفید نہ ہوتے تو حیاتِ انسان پریشان نظری کا شکار رہتی، ہم قیامت تک فکری اور نظری بھول بھلیوں میں بھٹکتے پھرتے۔ آپ نے ایسا جامع نظامِ حیات مکمل ضابطۂ زندگی اور بے داغ فلسفۂ عمل پیش کیا، جس کی مثال کسی اور نظام میں ممکن ہی نہیں۔ اس نظام نے ہمیں زندگی کے تمام شعبوں میں رہنما اُصول دیئے، معاشرت، معیشت، عقائد و عبادات، نظمِ حکومت و سیاست غرض کوئی

پہلو ایسا نہیں، جس کے لیے نظامِ مصطفےٰؐ میں مکمل رہنمائی موجود نہ ہو۔ آقا نے ہمیں کسی بھی پہلو سے کسی اور در پہ دریوزہ گری کا محتاج نہیں رہنے دیا۔

حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مقدس رحمت کی وہ گھٹا ہے، جو خشک اور بنجر ریگستانوں پر برسی تو کلفت و ضلالت کے گرد و غبار ختم ہو گئے، بے ہودگیوں اور بدعنوانیوں کی دھول بیٹھ گئی، ظلم و استبداد کی حدت خنکی میں تبدیل ہو گئی اور بداخلاقی و بے حیائی کے جھکڑ دم توڑ گئے۔

رحمت للعالمین کی بارانِ فیضان و کرم سے انسانیت کو کفر کے تپ سے نجات مل گئی، خیر و برکت کے سبزہ و گل کی افزائش ہوئی اور ظلم و عدوان کے بے برگ و بار ماحول میں لالہ و نسترن کھل گئے۔

رحمتِ عالم نورِ مجسم صلے اللہ علیہ وسلم کے نقوشِ قدم کاروانِ حیات کے لیے مینارۂ نور بن گئے۔ حضورؐ، جو مسلمانوں کے لیے رؤف و رحیم ہیں، ان کے لیے حریص ہیں، تمام جہانوں کے لیے رحمت بھی ہیں۔ نکتۂ "قالوا بلیٰ" کی تفسیر حضورؐ، آفرینشِ کائنات کا منشا حضورؐ، شبِ اسریٰ خدا کو آنکھ نہ جھپک کر دیکھنے والے حضورؐ۔ خدا جن کی عمرِ عزیز کی قسمیں کھائے، ان گلیوں کے حلف اُٹھائے، جن میں سرکار چلتے پھرتے تھے۔ خالقِ کائنات انکی اطاعت کو اپنی اطاعت اور انکی دشمنی کو اپنی دُشمنی قرار دے —— پھر کیوں نہ ہو کہ ایسی ہستی کو ہم جان و مال و اولاد سے عزیز رکھیں۔ ہمارے دل ان کے عشق میں ڈوبے ہوئے اور ہماری رُوحیں ان کی محبت سے سرشار کیوں نہ ہوں کیوں ہم خدا کے حکم پر عمل پیرا ہو کر ہر وقت ان پر درود و سلام کے پھول نچھاور کریں اور خدا کی سُنت پر عمل کرتے ہوئے ان کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان ہوں۔ خداوند کریم کے حکم اور صحابۂ کرام اور بزرگانِ دین کے اعمال کی پیروی میں انسان اور خصوصاً مسلمان کا رُواں رُواں سرکارِ دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم کے عشق کا مرکز کیوں نہ بن جائے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ نے قرآن پاک میں عشقِ رسول صلے اللہ علیہ وسلم پر زور

دیا ہے، حضورؐ کی محبت کو اہمیت دی ہے، خداوندکریم نے اپنے محبوب کے ہاتھ کو اپنا ہاتھ قرار دیا۔

(اور اے محبوبؐ! وہ خاک جو تم نے پھینکی، تم نے نہ پھینکی تھی، بلکہ اللہ نے پھینکی تھی)

(وہ جو تمہاری بیعت کرتے ہیں، ان کے ہاتھوں پر اللہ کا ہاتھ ہے) خدا نے فرمایا کہ جس کو حضورؐ اپنی جان سے زیادہ عزیز ہوں، وہ اپنے دعویٰ اسلام میں سچا ہے۔

(نبی کریمؐ مسلمانوں کو اپنی جان سے زیادہ عزیز ہیں)

پھر فرمایا کوئی شخص خدا سے محبت کے دعوے میں سچا نہیں، اگر حضورؐ کی اتباع نہیں کرتا اور جو حضورؐ کی پیروی میں پختہ کار ہے، وہ خدا کا محبوب ہے۔

(میرے حبیب، آپ فرما دیجئے کہ اے لوگو! اگر تم اللہ تعالےٰ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو، پھر اللہ بھی تم سے محبت کرے گا)

خداوند قدوس نے اسلام کے پیروؤں کو احترام رسول پاکؐ کی تلقین فرمائی:

(اے ایمان والو! اپنی آوازیں اونچی نہ کرو اس غیب بتانے والے (نبی) کی آواز سے اور ان کے حضور بات چلا کر نہ کہو جیسے آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ چلاتے ہو کہ کہیں اعمال اکارت نہ ہو جائیں اور تمہیں خبر نہ ہو)

پھر ارشاد ہوتا ہے کہ میرے محبوبؐ کا فیصلہ صدق دل سے نہ ماننے والے مومن کہلانے کے حقدار نہیں:

(تو اے محبوب! تیرے ربّ کی قسم وہ مسلمان نہ ہوں گے جب تک اپنے آپس کے جھگڑوں میں تمہیں حکم نہ بنائیں پھر جو کچھ تم حکم فرما دو، اپنے دلوں میں اس سے رکاوٹ نہ پائیں اور جی سے مان لیں)

اور جو مومن ہیں، وہ خدا اور اس کے فرشتوں کی تقلید میں اور خدا کے حکم کی تعمیل میں اپنے آقا و مولا صلے اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ وسلام کے گل ہائے عقیدت نچھاور کریں:

(بے شک اللہ اور اس کے فرشتے درود بھیجتے ہیں نبیؐ پر۔ اے ایمان والو! ان پر درود اور خوب سلام بھیجو)

قرآنی آیات میں دوسرے تمام انبیا و مرسلین کا نام لیا گیا ہے لیکن ہمارے آقا و مولا صلے اللہ علیہ وسلم کو اللہ جل شانہٗ نے قرآن حکیم میں آپ کے نام سے نہیں پکارا، کہیں آپ کو رسولؐ کہہ کر مخاطب کیا ہے، کہیں المزمل کہیں المدثر فرمایا گیا ہے۔ خدا نے کہیں آپ کے چہرۂ پرنور کی کہیں آپ کی عمرِ عزیز کی، کہیں آپ کی جائے قیام کی قسمیں کھائی ہیں۔

حضرت انس بن مالک انصاریؓ فرماتے ہیں کہ آقائے دو جہاں نے فرمایا۔ تم میں کوئی مومن نہ ہوگا۔ جب تک میں اس کے نزدیک اس کے ماں باپ اور اولاد اور سب آدمیوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔

(بخاری و مسلم)

بخاری شریف ہی میں ہے کہ رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا کہ جو شخص اللہ تعالےٰ اور اس کے رسولؐ کو ماسوا سے زیادہ پیارا رکھے گا، ایمان کی لذت وحلاوت پائیگا۔

خداوند کریم کی توحید تو حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے پہلے بھی اور بعد میں بھی مختلف قوموں میں کسی نہ کسی شکل میں عقائد کا جزو رہی ہے۔ اسلام میں رسالت پر ایمان کلمۂ توحید کا لازمی حصہ ہے۔ جب تک کوئی شخص حضورؐ کو خدائے لم یزل کا رسولِ برحق تسلیم نہیں کرتا، ان کی محبت کو اپنے لیے توشۂ آخرت نہیں سمجھتا، ان کے ارشاداتؐ عمل کو حرزِ جاں نہیں بناتا، اس کا عقیدۂ توحید پر یقین بے معنی ہو جاتا ہے۔

شرطِ ایماں ہے کہ اقرارِ رسالت بھی کرو
صرف اقرارِ الوہیت یہاں بے سُود ہے

حضورؐ کی وساطت کے بغیر خدا تک پہنچنے کا اسلام میں کوئی ذریعہ نہیں ہے بلکہ اسلام کو سب سے زیادہ سمجھنے والے، افضل الخلائق بعد الانبیا حضرت ابوبکر صدیقؓ کے نزدیک تو محبوبِ خُدا خود خدائے عزوجل سے زیادہ محبوب ہیں۔

معنیٔ حرفم کُنی تحقیق اگر
بنگری با دیدۂ صدیق اگر
قوّت قلب و جگر گردد نبی
از خدا محبوب تر گردد نبی
(اقبالؒ)

جب خداوند تعالےٰ نے خود فرمایا کہ اپنی اولاد، والدین اور تمام مخلوق سے زیادہ
ضورؐ کو محبوب نہ سمجھنے والے مومن نہیں ہیں تو ظاہر ہے کہ جس کا دل آپ کی محبت سے
ال ہے، اس کے مومن ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آقا و مولا علیہ التحیۃ والثنا
ے انتہائی عشق و محبت اور آپ کی اتباع و اطاعت اسلام کے عقیدۂ نبوت و رسالت
لازمی بنیادی جزو ہے ــــــ اور ظاہر ہے کہ آقا سے محبت نہ ہو تو ادب و احترام
یسے ہوگا۔ ان سے عشق نہ ہوا تو ذاتی خواہشات کو تج کر بلند تر مقاصد کے لیے جان و مال و
ر کی قربانی دینے کا خیال کس طرح پیدا ہوگا اور یہ جذبہ بیدار نہ ہوا تو کمالِ اطاعت
مقام کیونکر حاصل ہوگا۔

ہم فخرِ موجودات سرورِ کائنات علیہ السلام والصلوٰۃ کی اُمت کے افراد ہیں۔ سرکارؐ
ی وجہ سے ہمارا تشخص قائم ہے۔ اُنہوں نے ہمیں صراطِ مستقیم دکھائی۔ خدا کی وحدانیت
تصور ہمارے اذہان و قلوب میں راسخ کیا۔ ہمیں نیکی اور بدی کا فرق سمجھایا، ہمیں دُنیا
ں رہنا سکھایا اور آخرت میں کامیابی کے طریقے سمجھائے ــــــ لیکن محسنِ عالم
لے اللہ علیہ وسلم کی حیثیت کسی ایک قوم کے رہنما کی نہیں ہے۔ انہیں خداوند کریم نے
اری کائنات کو گمراہی کے اندھیروں سے نکالنے کے لیے مبعوث فرمایا۔ ان کا پیغام
ی طرح بھی محدود نہیں ہے۔ اس کا دائرہ کار ہر شے کو محیط ہے۔ رب العالمین
شانہٗ نے انہیں رحمۃ للعالمین کہا اور سارے جہانوں کے لیے رحمت ہیں۔ انہوں نے
من و سکون و عافیت کو اپنے حیطۂ اقتدار پر پھیلایا، سارے عالم ان کی رحمت سے
تمتع ہوتے ہیں۔ جب رحمتِ عالم ہادیٔ اعظم صلے اللہ علیہ وسلم دُنیا پر تشریف لائے،

اگرچہ عرب اپنے اخلاق کے اعتبار سے قعرِ مذلت کا شکار ہو چکے تھے، توحید خداوندی
کا تصور ان کی زندگیوں میں عنقا تھا، ان کا وطن برائیوں اور بداعمالیوں کی آماجگاہ بن
گیا تھا مگر یہ حالت صرف عرب ہی نہیں تھی، تمام کائنات میں یہی "گربڑ" تھی چنانچہ
حضور پُرنورؐ صلے اللہ علیہ وسلم صرف عرب ہی کی اصلاح کے لیے نہیں بھیجے گئے
تھے، عرب اور غیر عرب سب اس میں شامل تھے۔ پھر حضورؐ صرف چند برسوں یا ایک
قرن اور عہد کے لیے مبعوث نہیں کئے گئے، ان کی رسالت کا دائرہ تا قیامِ قیامت
ہے۔ خداوندکریم نے دین کو ان پر مکمل کر دیا، انہیں انبیا و رسل کا خاتم فرمایا۔ حکم
دے دیا کہ ان کے بعد نبوّت کے دروازے بند ہو گئے ہیں، اپنے محبوب کو بھیج کر اس
نے یہ سلسلہ ہی ختم کر دیا۔

پھر خداوند قدوس نے سرکارِ دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم کو ہم انسانوں کی ہدایت
کے لیے بھیجنے کو مسلمانوں پر احسان کہا ہے، اپنے محبوب پاکؐ کے رُخِ انور کو والشمس
قرار دیا ہے، ان کی زلفوں کو واللیل سے تشبیہ دی ہے۔ یہ بھی حکم دیا ہے کہ مسلمانوں
میں سے جو شخص اپنی جان پر کوئی ظلم کر بیٹھے، وہ میرے محبوب کے پاس حاضر ہو،
اللہ سے توبہ کرے، میرے محبوب سے استغفار چاہے تو اللہ اس پر کرم کرے گا۔ خالق و
مالکِ کائنات نے یہ بھی فرمایا ہے کہ میرے محبوب کا جو بندہ اپنے آپ پر کوئی زیادتی
کر بیٹھے، اس سے کوئی غلطی سرزد ہو جائے، وہ اللہ کی رحمت سے نا اُمید نہ ہو۔ ربِ کریم
نے اپنے خلاف ژاژخائی کرنے والوں کو کبھی کچھ نہیں کہا مگر اس کے حبیب پاکؐ کی جس
شخص نے توہین کرنے کا ارادہ کیا، اللہ نے اس کے خلاف کہا بھی اور کیا بھی۔ اس
نے لوگوں کو ہاتھ ٹوٹنے کے کوسنے بھی دیئے، اس نے عبرت کے لیے لوگوں کے
ناکڑے پر نشان لگانے کی بات بھی کی اور ظاہر ہے کہ صاحبِ کُن کی بات دُرست
بھی ثابت ہوئی۔ اس جبّار و قہار خدا نے ویسے تو یہ التزام کر رکھا ہے کہ لوگوں کے
پردے رہ جائیں، قیامت کے دن بھی لوگ اپنی ماؤں کے نام سے پکارے جائیں
گے۔ لیکن جس خرنا شخص نے شہنشاہِ کونین کو (نعوذ باللہ) مجنون کہا تھا، خدا نے

قرآن پاک میں اس کی پردہ دری کر دی ہے اور دُنیا کو بتا دیا کہ یہ شخص زنا کی اولاد ہے،
غرض محبت کرنے والے نے اپنے محبوب کی تعریف میں جہاں فصاحت و بلاغت
کے دریا بہا دیئے، وہاں حضورؐ کی توہین و تضحیک کا ارادہ کرنے والوں کو اپنے جلال
کا رُخ بھی دکھایا۔

یہ ہماری خوش بختی ہے کہ خداوندِ تعالیٰ نے ہمیں ایسے جلیل القدر پیغمبرؐ ایسے
افضل البشر، ایسے امام الانبیا، ایسے نورِ مجسم کی اُمت میں پیدا کیا۔ یہ بھی ہمارے
مقدر کی بات ہے کہ ہمیں اس نے سرکارؐ کی محبت عطا کی۔ ہم ان کا ذکر کرتے ہیں تو
سراپا ادب بن کر ——— ہم ان کا مبارک نام لیتے ہیں تو عقیدت و ارادت کی گہرائیوں
سے، ہم سرکارؐ کا اسم گرامی سُن کر دُرود سلام کے ڈونگرے نچھاور کرتے ہیں اور جب حضورؐ
کے ناموس کی خاطر مشیت ہم سے قربانیاں طلب کرتی ہے تو ہم میں سے جو خوش قسمت
ترین لوگ ہوتے ہیں، جن کی محبت کو سرکارؐ نے قبول فرمالیا ہوتا ہے، وہ اس سے بھی گریز نہیں
کرتے، بلکہ ہنسی خوشی اپنی جان و مال و آبرو کو سرکارؐ کے لیے نچھاور کرنا توشۂ آخرت
سمجھتے ہیں۔ ہم ہر سال عید میلادُ النبیؐ کے موقع پر اپنی زندگی کا ثبوت دیتے ہیں ہر
شہر اور ہر قصبہ آقا و مولا علیہ التحیۃ والثنا کی ولادت کی خوشی میں بقعۂ نُور بنا دیا جاتا ہے۔
ہر جگہ محافل میلاد منعقد ہوتی ہیں۔ رحمت عالم نورِ مجسم صلے اللہ علیہ وسلّم کا ذکر پاک کرکے،
ان کی تعریف و ثنا میں رطب اللسان ہوکر ہم اپنے خالق کی سُنّت پر عمل کرتے ہیں۔
عید میلاد ہمارے لیے خوشیوں کا گہوارہ ہوتی ہے، مگر ہم میں سے بیشتر ایک کمزوری
کا شکار ہیں۔ وہ عید میلاد پر سرکارؐ کے ارشادات کی روشنی میں اپنے اعمال و افکار و کردار
کا جائزہ نہیں لیتے۔ حضورؐ کی اُمت میں ہونے کی وجہ سے فخر کا اظہار کرتے ہیں، مگر یہ
دیکھنا گوارا نہیں کرتے کہ کہیں ہماری زندگیوں پر ایسے جرائم تو حاوی نہیں ہو گئے جن
کی وجہ سے آقا و مولا صلے اللہ علیہ وسلّم ہمیں راندۂ درگاہ کر دیں۔ سلطان دارین کی نعت و
مدحت اور ان کا ذکر پاک بالکل بجا اور بہت اچھا فعل ہے، لیکن ان کے احکام سے سرتابی،
ان کے ارشادات سے قطعِ نظر، ان کی سُنّت اور ان کے بتائے ہوئے فرائض سے

صرفِ نظر کرنا کتنا بڑا جرم ہو سکتا ہے، اس کا اندازہ کرنا ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی
کے لیے ضروری ہے۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ ہم کسی شخصیت کی تعریف بھی کریں، اس
کو اپنا رہنما و مقتدا بھی قرار دیں، اس کے علوِ مرتبت کا احساس بھی کریں، اور اس کی
بات کو ماننے سے عملاً انکار بھی کر دیں۔ یہ تو کوئی محبت نہ ہوئی کہ ممدوح کے احکام و ارشادات
کو بالائے طاق رکھ دیا جائے۔ عید میلادُ النبی (صلے اللہ علیہ وسلّم) کے موقع پر ہمیں
اس نقطۂ نظر سے احتسابِ نفس کی بھی ضرورت ہے ہم یہ بھی تو دیکھیں کہ ہم حضورِ پُر نورؐ
کی تعریف و ثنا کرنے والے عملاً کہاں کھڑے ہیں ———

محبوبِ کبریا احمد مجتبیٰ محمد مصطفےٰ علیہ التحیۃ الثنا اخلاق کے فروغ کے لیے
مبعوث کیے گئے، انہوں نے ہمیشہ اخلاق کے اُصولوں کی پاسداری کی بلکہ اخلاق کے
اصولوں کی نیو رکھی۔ اللہ کریم نے ان کے خلق کو عظیم کہا، اب ہم سرکارؐ کے محبوں کو
اپنے گریبانوں میں جھانک کر دیکھنا چاہیئے کہ ہم کہاں تک حضورؐ کے اخلاقِ حسنہ کی پیروی
کرتے ہیں اور کس کس جگہ سے اپنے اندر کمزوری پاتے ہیں۔ پھر اس کمزوری کو رفع
کرنا اور حضورؐ کے اسوۂ حسنہ کی پیروی کو مکمل طور پر شعار کرنا ہمیں سچا مسلمان اور
حضورؐ کا سچا محب بنائے گا۔ ہمیں دیکھنا ہوگا کہ رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو
صادق و امین کہتے نہ تھکنے والے صداقت و امانت کو کس حد تک شعار کیے بیٹھے ہیں۔
دن بھر میں کتنی دفعہ دروغ گوئی سے کام نکالتے ہیں۔ بُغض اور کینہ ہمارا ساتھی تو نہیں؟
غیبت کو اپنا کر ہم اپنے آقا کے ارشاد کے مطابق اپنے مُردہ بھائی کا گوشت تو نہیں
کھا رہے ———؟

جھوٹ بولنے والوں پر میرے آقا و مولا کے خالق و مالک نے لعنت کی ہے،
سرکارؐ نے جھوٹ سے اپنے پیروؤں کو ہمیشہ نفرت کی تلقین کی ہے پھر کہیں ہم اس
صفت سے متصف تو نہیں ہوتے جا رہے؟ حضورؐ نے کسی مسلمان کے قتلِ عمد
پر سخت وعیدیں دی ہیں، ہمارے اخبار جو قتلوں کی خبروں سے بھرے ہوتے ہیں،
کیا ہم کفار کو قتل کرتے ہیں؟

آقا نے یتیم کا مال نہ کھانے، کسی کا حق غصب نہ کرنے کی ہدایت فرمائی ہے۔ کیا ہم اپنی عملی زندگیوں میں اس کا التزام کرتے ہیں؟ سرکار نے ہمیں معاشرت کے اُصول بتائے ہیں، معیشت کو مضبوط کرنے کی باتیں واضح کی ہیں، حکومت کرنا سکھایا ہے، ہر قسم کی تعلیم دی ہے مگر ہم کہیں اس تعلیم سے مُنہ تو نہیں موڑے بیٹھے؟ حسنِ معاشرت مسلمانوں کی انفرادیت ہے۔ ہمیں آقا نے بتایا ہے کہ نسل، رنگ یا مقام کے لحاظ سے مسلمانوں میں کوئی تفاوت نہیں ہے، سب ایک ہی درخت کی شاخیں پتے ہیں۔ انہوں نے بتایا ہے کہ ہم میں کوئی گورا ہو یا کالا، مفلوک الحال اور حسرت زدہ ہو یا دولت مند اور باثروت، سرزمین حجاز کا باسی ہو یا افریقہ کا رہنے والا، خطِ استوا کے قرب سے مستفید ہوتا ہو یا اس سے دُور ہو ——— اگر متقی ہے، نیکیوں کو شعار کئے ہوئے ہے، برائیوں سے بچتا ہے اور شرافت کی راہوں کا راہی ہے تو اللہ کے نزدیک اکرم ہے ورنہ ایک بہت بڑا صفر ہے۔

رسول معظم صلے اللہ علیہ وسلم نے ہمیں تعلیم دی ہے کہ حاکمیتِ اعلیٰ صرف اللہ جل جلالہٗ کی ہے۔ انسان دُنیا میں اس کا نائب ہے، وہ نیابت کے فرائض ادا کرے گا، حاکم نہیں بن بیٹھے گا۔ قوانین وہی مسلمانوں کیلئے لائق تسلیم ہیں جو خدا اور رسُول خدا (جل جلالہٗ و صلے اللہ علیہ وسلم) نے بنائے ہیں۔ پھر کیا ہمارے نزدیک حکومت کا معیار یہی ہے، ہم اسی راہ کو اپنائے ہوئے ہیں یا کسی دوسری راہ پر افتخار و ابتہاج کا مظاہرہ کرتے ہیں؟

ممدوحِ خالق و مخلوق صلے اللہ علیہ وسلم نے ہماری معیشت کے اُصول متعین فرما دیئے ہیں۔ اگر دولت کمانے کی حدود ہیں تو خرچ کرنے میں بھی رہنمائی ہے۔ ہم دولت جہاں ناجائز طریقوں سے کما نہیں سکتے، وہاں غیر پسندیدہ کاموں پر خرچ بھی نہیں کر سکتے۔ جہاں پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ملکیت کی حد مقرر نہیں کی وہاں اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی اہمیت بھی بتائی ہے اور اکتناز و احتکارِ زر کے سلسلے میں وعیدیں بھی سخت رکھی ہیں۔ جہاں ہمیں یہ کہا گیا ہے کہ اپنی ضرورت سے زیادہ

مال کو خدا کی راہ میں خرچ کر دو، وہاں اسی کے بین السطور یہ قدغن بھی ہے کہ اپنی ضرورت کا مال اپنے لئے رکھو، اسے بھی دوسروں میں تقسیم نہ کر دینا کہ کہیں خود کنگلے نہ ہو جاؤ۔

سرکار دو عالم صلے اللہ علیہ وسلّم کی بتائی ہوئی راہ ہر لحاظ سے متوازن ہے۔ اس میں افراط و تفریط کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی لیکن ہم حضورؐ کے نام لیوا کیا کر رہے ہیں؟ ہم حضورؐ سے محبت کے دعویدار ان کی عقیدت پر مفتخر لوگ، عمل میں ان کے ارشاداتؐ کو حرزِ جاں کیوں نہیں بناتے؟ ہم میں سے کچھ لوگ تو دُنیا کے مال کو اکٹھا کرنے میں شب و روز مصروف ہیں۔ اس کے لیے وہ اپنے مسلمان بھائیوں کی جیبیں کاٹتے ہیں، کھانے پینے کی چیزوں حتیٰ کہ دوائیوں تک میں ملاوٹ کرتے ہیں، ہر قسم کے ناجائز ذرائع استعمال کرتے ہیں کہ امیر سے امیر تر بن جائیں۔ سامانِ تعیش کے استعمال سے سرکار نے ہمیں شدّت کے ساتھ منع کیا تھا۔ مگر یہ اہل ثروت کا اوڑھنا، بچھونا بن گیا۔ ہم کمائی بھی ناجائز ذرائع سے کرتے ہیں اور خرچ بھی غلط کاموں پر کرتے ہیں۔ خدا کی راہ میں خرچ کرنے والے بہت کم ہوں گے اور بہت کم خرچ کرتے ہوں گے۔ سرورِ کائنات علیہ السلام والصلوٰۃ نے گردشِ دولت کے جو اُصول بنائے، ہم ان سے نفور ہیں، نتیجہ یہ ہے کہ دولت چند ہاتھوں میں مرتکز ہو کر رہ گئی اور معیشت برباد ہو رہی ہے۔

ہمارے آقا و مولا صلے اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا، جو حسد کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے ——— پھر ہم اس پر کبھی غور تو کریں کہ سرکارؐ کا نام تو لیتے ہیں، عید میلاد کے دن جلوس میں بھی شامل ہوتے ہیں، جلسے بھی کرتے ہیں اور سُنتے ہیں، نعتیں بھی پڑھتے ہیں، حضورؐ کی خدمت میں ہدیہ درود و سلام بھی پیش کرتے ہیں لیکن کہیں ایک دوسرے سے حسد تو نہیں کرتے۔ کبھی یہ بھی تو دیکھیں کہ ہم پر دن بھر میں اس مرض کے کتنے حملے ہوتے ہیں؟

حضورؐ نے فرمایا "جو رحم نہیں کرتا، اس پر رحم نہیں کیا جاتا"۔ اس پر ہم نے کبھی غور کیا ہے کہ ہم رحم سے محروم ہونے کی کون سی منزل پر پہنچ چکے ہیں؟ سرکار نے فرمایا "شب برات کو اللہ سب کو بخش دیتا ہے، سوائے کینہ پرور شخص کے"۔ پھر ہم نے

اپنے کرداروں میں سے بغض و کینہ کی بیخ کنی کی ہے یا اپنے دلوں میں اس کی تخم ریزی میں مصروف ہیں؟

فخرِ دو عالم نورِ مجسم صلے اللہ علیہ وسلم تو ایک کامل و اکمل دین لے کر آئے انہوں نے تو ہر شعبۂ زندگی میں دُنیا کی پوری پوری رہنمائی فرمائی۔ اس میں کسی پہلو سے کوئی خلا نہیں مگر میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اپنے آقا و مولا، محبوبِ کبریا، ممدوحِ خدا علیہ التحیۃ والثنا کی مدحت بڑی چیز ہے، بہت اچھا کام ہے۔ عید میلادُ النبیؐ کی تقریبات کا انعقاد ہمارے لیے دُنیا و آخرت میں بھلائی کا پیش خیمہ ہے۔ اگر حضورؐ سے اُلفت و ارادت کو اوڑھنا بچھونا نہیں بناتے تو ہم مسلمان کہاں کے ہیں کہ خود خداوند قدوس نے ایمان کو حضورؐ کی محبت سے مشروط قرار دیا ہے، مگر صرف ان جلسوں اور محبت کے خالی خولی دعووں سے سرکارؐ ہم سے خوش نہیں ہو سکتے وہ عالمین کے لیے رحمت بنا کر بھیجے گئے تھے۔ ہم اگر اپنے مسلمان بھائیوں ہی کے لیے کسی حیثیت سے زحمت بن جاتے ہیں تو ڈر ہے کہ سرکارؐ ہمیں اپنانے ہی سے انکار نہ کر دیں۔ ہمیں آقا کے پیغام پر عمل اور ان کی سیرت کی پیروی کرنا چاہیے۔ اس کے بغیر ہمارے دعوے باطل اور ہماری باتیں محض زبانی جمع خرچ ہی کہلائیں گی۔ خداوند کریم ہمیں اسوۂ سرکارؐ پر چلنے کی توفیق عنایت فرمائے۔ آمین!

معراجِ سرکارؐ صلی اللہ علیہ وسلم

چیست معراج؟ آرزوئے شاہدے
گفتگوئے روبروئے شاہدے

خداوندِ قدوس و کریم نے اپنے محبوب پاک صاحبِ لولاک صلے اللہ علیہ وسلم کو شاہدؐ بنا کر بھیجا۔ شاہد کے معنی گواہ کے ہیں اور شہادت اس کی معتبر ہے جو "عینی شاہد" ہو۔ شاہد کے لیے مشاہدہ ہونا ضروری ہے۔ سرورِ کائنات فخرِ موجودات صلے اللہ علیہ وسلم کائنات کی ہر شے کے شاہد ہیں۔ تمام موجودات آپ ہی کے دم سے معرضِ وجود میں آئے، آپ کے سامنے ہر چیز بنی۔ آپ تمام جہانوں کے لیے رحمت ہیں۔ سب دُنیا میں آپ کی نگاہِ مرحمت ہیں ہیں۔ ہر شخص کے نیک و بد کے آپ شاہد ہیں اور آپ ہی کی گواہی اور رحمت پر قیامت کے حساب و احتساب کا دار و مدار ہے۔ شاہد کے معنی حاضر و موجود کے ہیں۔ ظاہر ہے، غیر حاضری اور لاعلمی شہادت کی بُنیاد نہیں ہو سکتی۔ شاہد کا مطلب، محبوب بھی ہے۔ اس لیے کہ محبوب ہر وقت محب کے دل میں موجود رہتا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے اپنے شاہد کی شہادت کو مکمل اور اکمل کرنے کیلئے انہیں ایک رات مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ تک اور پھر آسمانوں کی اور پھر عرشِ معلّٰی کی اور آخرکار لامکاں کی سیر کرائی۔ دَنا کے قصر میں قابَ قوسین کی قربتوں سے مستفید کیا اور پھر دُنیا کو اَوْ اَدْنیٰ کی خبر سُنائی۔

دَنا کے قصر میں قوسین کا تقرب ہے
خدائے پاک سے یوں محوِ گفتگو تو ہے

سرکارؐ زمینوں کے شاہد، ہفت سماوات کے شاہد، تمام موجودات و مخلوقات کے گواہ —— اور خدائے پاک کے محبوب اور گواہ۔ عینی شاہد۔ مازاغ البصرُ ماطغیٰ۔

موسیٰؑ ز ہوش رفت بہ یک جلوۂ صفات
تو عین ذات می نگری در تبسمی!

آقا و مولا علیہ التحیۃ والثنا کائنات کے شاہد ہیں۔ کائنات کے محبوب ہیں، کائنات میں ہر کہیں حاضر و موجود ہیں، آپ خدا کے محبوبؐ ہیں، لامکاں میں موجود کیوں نہ ہوتے۔ اپنے خالق و مالک کو کیوں نہ دیکھتے، بغیر آنکھ جھپکے۔

شاہدیت کی کاملیت و اکملیت کے خیال سے اور اپنے محبوبؐ سے وصال کے لیے اللہ عزوجل نے آپ کو بلا بھیجا۔ جبریل امین علیہ السلام پیغام لائے۔ لیکن اگر حضورؐ کو اپنی قیام گاہ سے بلایا جاتا تو جبریل کے لیے دو ہی صورتیں تھیں۔ یا آپؐ کی اجازت کے بغیر گھر میں داخل ہوتے یا باہر سے آپؐ کو اجازت کے لیے پکارتے۔ مومنوں کے لیے یہ دونوں صورتیں ممکن نہیں۔ اس لیے اپنے گھر کے علاوہ کہیں اور سے بلا بھیجنے کا اہتمام کیا گیا۔ خدا کے محبوبؐ کو تکلیف دینا جبریل علیہ السلام کو کب گوارا تھا چنانچہ۔

نور نے تلووں کو سہلا کر جگایا خواب سے
یوں ہوا سرکارؐ کا معراجِ جسمانی شروع

سبحان اللہ! اندازہ تو فرمائیے۔ سرخیلِ گروہ ملائکہ اپنے پروں کو سرکارؐ کے پیروں پر مل کر جگانے کا اہتمام کرتے ہیں۔ خالق و مالک کائنات چشم براہ ہے، فرشتے اور حوریں پرے باندھے پیشوائی کو کھڑے ہیں۔ افلاک میں، عرشِ معلیٰ پر، ہر جگہ آپ کی آمد آمد کا تذکرہ ہے۔ خدا جن پیاروں سے پیاری پیاری گفتگو فرماتا ہے، ان کے "رَبِّ اَرِنِیْ" کے جواب میں "لَنْ تَرَانِیْ" کہتا ہے مگر جس سے محبت کرتا ہے، انہیں "اُدْنُ مِنِّیْ" سے نوازتا ہے۔ کسی کے جلوۂ صفات کے برداشت نہ کر سکنے کی بات اور ہے اور کسی کو ذات کی تجلیوں سے مستنیر کرنا دوسری بات ہے اور یقیناً بہت بڑی بات ہے۔

مصطفیٰؐ راضی نہ شد اِلّا بذات

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ مجھے

میرے رب نے فرمایا ہے کہ میں نے ابراہیمؑ کو دوستی دی، موسیٰؑ سے کلام کیا اور آپ کو مواجہ بخشا کہ بے پردہ و حجاب آپ نے میرا جمال دیکھا۔ ترمذی میں ہے حضرت عبداللہ ابن عباسؓ نے فرمایا کہ حضورؐ نے اپنے رب کو دیکھا۔ ان کے شاگرد عکرمہ کہتے ہیں۔ میں نے عرض کی کہ کیا سرکارؐ نے اپنے رب کو دیکھا۔ فرمایا ہاں اللہ تبارک و تعالیٰ نے موسیٰؑ کے لیے کلام رکھا، ابراہیمؑ کے لیے دوستی اور محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کے لیے دیدار۔

حضرت ابن عباسؓ فرمایا کرتے تھے۔ بیشک حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے دو بار اپنے رب کو دیکھا۔ ایک بار اس آنکھ سے اور ایک بار دل کی آنکھ سے۔

دوسرے تمام انبیاء کرام کی رسائی بارگاہِ خداوندی میں ایک خاص مقام تک ہوئی مگر محبوب کبریا احمدِ مجتبےٰ محمد مصطفےٰ علیہ التحیۃ والثناء قربِ کبریائی کی اس منزل پر پہنچے کہ انہیں لے جانے والے روح الامینؑ راستے ہی میں تھک کر بیٹھ گئے۔

پہلے تو وہ ہم رکابِ سرورِ کونینؐ تھا
ہو گئی جبریلؑ کی سدرہ سے حیرانی شروع

سدرۃ المنتہےٰ تک تو حاجبِ نبویؐ نے معیت کا شرف حاصل کیا، پھر اس کے بعد کا سفر آقاؐ کا خالق جانے کہ کیسے ہوا، جبریل امینؑ تو اس مقام سے ذرہ بھر آگے جانے کے تصور سے لرزاں تھے۔

اگر یک سرِ موئے برتر پرم
فروغِ تجلی بسوزد پرم!!

پھر سرکارؐ نے وصال کی وہ منزلیں طے کیں کہ اس کے نتیجے کے طور پر ہمیں خدا کی ہستی کی محسوس شہادت میسر آئی۔ مشہور ادیب و نقاد ڈاکٹر سید عبداللہ معراج النبیؐ کے موضوع پر ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔

"معراج سے مسلمانوں کے ایمان بالرسالت میں گہرائی پیدا ہوئی اور حضورؐ کی اکملیت اور شرافت کا یقین محکم ہوا۔ جہاں بعض دوسرے انبیاء کا آسمانی سفر نبوت کے راستے کی آخری منزل قرار پایا۔ اس سے ایقان میں گہرائی پیدا ہوئی اور خدا کی ہستی کی محسوس

شہادت میسر آئی"

(فکر و نظر، اسلام آباد سیرت نمبر ۱۹۷۶ء)

یعنی تمام گروہِ انبیاء و رسل ؑ کی سمعی شہادتوں کے بعد سرکارِ دو عالم نورِ مجسم صلے اللہ علیہ وسلم کی عینی شہادت پر بات مکمل ہو گئی۔

نبی معراج میں اللہ سے ملنے کو جاتے تھے
انوکھی میزبانی تھی نرالی تھی یہ مہمانی!

اللہ کریم جل شانہٗ نے قرآنِ پاک میں "سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ" کہہ کر حضورؐ کے معراجِ جسمانی پر مُہرِ ثبوت ثبت کر دی۔ "پاک ہے وہ ذات جس نے سیر کرائی اپنے بندے کو" عبدہٗ کہنے کے بعد گفتگو کی گنجائش ہی کیا ہے کہ معراجِ جسمانی کے بجائے اسے رُوحانی معراج قرار دیا جائے۔

ہے "سُبحان الذی اسرا بعبدہٖ" سے یہ ظاہر
کہ تھی منظورِ حق کو آپ کی اعزاز فرمائی!

ربِّ دو عالم کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ یہاں "عبدہٗ" کی بات کر کے اس نے معراجِ جسمانی کے منکرین کا مُنہ بند کر دیا۔ ورنہ اپنے پیارے حبیبؐ کے لیے وہ کوئی اور لفظ استعمال کر لیتا۔ مگر اس سے بعض ناسمجھوں نے "حضورؐ کو اپنے جیسا بشر" (نعوذ باللہ) کہنے کا جواز تلاش کرنا چاہا ہے۔ ایسے بدقسمتوں کو شاعرِ مشرق حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے بتایا ہے کہ عبد اور عبدہٗ میں فرق کو ملحوظ رکھو ورنہ تمام اعمال حبط ہو جائیں گے، قعرِ دوزخ کی نذر ہو جاؤ گے۔

عبد دیگر، عبدہٗ چیزے دگر
ما سراپا انتظار، او منتظر!

عبد وہ ہے جو اپنے رب کا انتظار کرے۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہِ سینا پر جلوۂ صفاتِ ایزدی کے منتظر تھے اور عبدہٗ وہ ہے جس کا ربِّ دو جہاں انتظار کرے۔ علامہ اقبالؒ نے وضاحت سے بتایا ہے کہ عبدہٗ دہر ہے اور دہر عبدہٗ کے دم قدم سے

ہے، ہم سب عبد ہیں اور رنگ ہیں، عبدہٗ بے رنگ و بُو ہے، عبدہٗ کے اسرار سے آگاہی چاہنے والے جان لیں کہ وہ "الا اللہ" کے راز کے سوا کچھ اور نہیں۔ لا الٰہ تلوار ہے مگر اس کی دھار عبدہٗ ہے اور عبدہٗ کے مقام کا عرفان اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک قرآنِ مجید میں "وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی" کے مقام کو نہ سمجھا جائے۔

چنانچہ یہ عبدہٗ وہ مخبرِ صادق ہے جس نے اپنی چشمِ مُبارک سے دیدارِ خدا سے مشرف ہو کر ہمیں یقین دلا دیا کہ خدا ہے۔

پُوچھا کسی نے مجھ سے، بتا دیجئے ذرا
اس بات کا یقین ہو کیونکر کہ ہے خدا

میں نے کہا کہ مخبرِ صادق نے دی خبر
دیکھا ہے جس نے چشمِ مُبارک سے برملا

جھپکی ذرا بھی آنکھ نہ اٹھنا ئے دید میں
آیا ہے جس کی شان میں مازاغ، ماطغٰے

مجھ کو اسی شہادتِ عینی پہ ناز ہے
جس کے ہیں وہ حبیبؐ وہی ہے مرا خدا

علامہ اقبالؒ کہتے ہیں کہ دُنیا یہ سمجھتی رہی کہ یہ زمین و آسمان ناقابلِ گزر ہیں۔ سائنس اور دنیوی علوم کی رسائی اس حقیقت تک نہیں ہوئی تھی کہ تسخیرِ کائنات نہ صرف ممکن ہے بلکہ ایک انسانِ کامل جو نُورِ مجسم تھے، اُنھی کی رہنمائی میں ہم کائنات کی ہر شے کو مسخر کر سکتے ہیں۔

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں

خداوندِ کریم نے قرآنِ پاک میں ہمیں تسخیرِ کائنات کی نوید سُنادی تھی۔ حضور علیہ السلام والصلوٰۃ نے اس کے عملی ثبوت بھی دُنیا کے سامنے پیش فرما دیئے۔ چاند کو اُنگلی کے اشارے سے دو ٹکڑے کر کے آقا و مولاؐ نے ہمیں یہ راہ سُجھائی کہ ہم چاند کو پاؤں تلے روند سکتے ہیں۔

آپ کی انگشت کا ادنیٰ اشارہ ہے وہ خط
جس سے ظاہر راہِ تسخیرِ مہ کامل ہوئی !

اقبالؒ نے کہا ہے ———

سبق مِلا ہے یہ معراجِ مصطفےٰؐ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

مجھے اس بات پر سخت حیرت ہوتی ہے کہ کچھ لوگ اس بات کے قائل نہیں کہ سرکارؐ اپنے جسدِ مُبارک کے ساتھ افلاک، عرشِ بریں اور لامکاں کی پہنائیوں میں تشریف لے گئے تھے۔ بھئی! اگر یہ خواب ہی کا قِصّہ ہوتا، صرف رُوحانی سفر ہی کی داستان ٹھہرتی تو کفار کو اس پر ہنگامہ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ کوئی بھی اس کو نہ ماننے کی بات کیوں کرتا۔ حضرت ابوبکرؓ بس اتنی سی بات پر صدّیقِ اکبرؓ بن گئے تھے کیا، کہ حضورؐ نے رُوحانی معراج کا شرف حاصل کیا اور آپ نے تصدیق کی ——— بعض حضرات اسے تاکن بتاتے ہیں کہ رات کے ایک قلیل عرصے میں آپ نے یہ تمام سیر فرمائی۔ مسجدِ اقصیٰ میں سابقہ انبیاء کرام کی امامت فرمائی، آسمانوں کی سیر کی، جنّت و دوزخ کو دیکھا، عرشِ معلّیٰ اور لامکاں گئے اور اپنے ربّ سے باتیں کیں۔

حضورؐ نبی ہیں اور انبیاء کو جو معجزات عطا ہوتے ہیں، وہ سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہوتی۔ کوئی مُردوں کو کیسے زندہ کر سکتا ہے۔ چاند کسی سے دو ٹکڑے ہو سکتا ہے؟ ایک جامِ شیر سے ستر صاحبوں کا دُودھ سے مُنہ بھرنا ممکن ہے؟ معجزہ تو ہوتا ہی وہ

ہے جو عقل سے ماورا ہو ——— اور معراج النبیؐ "وَّ علیٰ کُلِّ شَیءٍ قَدِیْر" رب کی طاقت کا مظاہرہ ہے۔ اس نے فرمایا کہ "پاک ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے کو سیر کرائی"۔ کیا خدا کی قُدرت سے یہ بات بعید ہے کہ ایسا ہو؟

اور پھر عقلِ انسانی ہی کی بات کریں تو یہ بات ناممکن نظر نہیں آتی۔ ایک کارخانے میں سینکڑوں مشینیں کام میں مصروف ہوں، کارخانے کا مالک اپنے کسی محبوب دوست سے مُلاقات کی خوشی میں کارخانہ بند کرنے کا حکم دے دے تو جو مشین جہاں ہوگی، وہیں رُک جائے گی اور جب مالک کے حکم سے کارخانہ دوبارہ چلے گا، ہر مشین وہیں سے چل پڑے گی، جہاں وہ ٹھہری تھی۔ چنانچہ اگر کارخانۂ قدرت کا مالک خداوندِ قدس ولایزال کارخانۂ عالم کو روک دیتا ہے تو اس میں سمجھ نہ آنے والی بات کیا ہے۔

اور ایک بات یہ بھی تو ہے کہ حضورؐ جانِ کائنات ہیں، رُوحِ موجُودات ہیں۔

وہ جو نہ تھے تو کچھ نہ تھا، وہ جو نہ ہوں تو کچھ نہ ہو
جان ہیں وہ جہان کی اور جان ہے تو جہان ہے

ہم پر آج تک عذاب کی وہ صُورت بھی تو نافذ نہیں کی گئی جو دوسری قوموں پر کی گئی۔ اس لیے کہ سرکارؐ ہم میں موجُود ہیں۔ "اَنْتَ فِیْھِمْ" نے ہمیں دامنِ رحمت میں ڈھانپ رکھا ہے۔ پھر جب جانِ کائنات وصلِ حق کے لیے روانہ ہوئی تو کائنات کا ذرّہ ذرّہ جہاں تھا، وہیں رُک گیا۔ جب آپ واپس تشریف لائے، کنڈی بھی ہلنے لگی اور بستر بھی اسی طرح گرم کیوں نہ ہوتا۔

محبوب و محب میں کیا باتیں ہوئیں۔ خالق نے اپنے بندے کو کیا دیا ——— اس سلسلے میں ہمارے لیے جو جو کچھ ضروری تھا، وہ خدا اور رسُولِ خدا (جل شانہٗ وصلی اللہ علیہ وسلّم) نے ہمیں بتا دیا۔ اس سے زیادہ کی نہ ہمیں ضرورت تھی نہ ہماری اوقات ہے کہ اس سے واقف کیے جائیں۔ دَنیٰ فَتَدَلّٰی۔ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنیٰ کی جس قدر بھی تشریحات کر لی جائیں، ٹھیک ہیں۔ اصل میں بات کبریا، اور محبوبِؐ کبریا کی ہے اور آپس میں فاصلہ نہ ہونے کی ہے۔

وہ جو نہ تھے تو کچھ نہ تھا، وہ جو نہ ہوں تو کچھ نہ ہو، جان ہیں وہ جہان کی اور جان ہے تو جہان ہے۔

محبوب و محب دونوں میں کیا فاصلہ ہوتا
قوسین میں جب ان کی ملاقات ہوئی تھی

بس! ہمارے لیے تو یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ جب یہ منازل طے ہوئیں جب محبوب و محب میں وصل کا سماں تھا، اُس وقت بھی سرکارؐ نے اپنی گنہگار اُمت کا خیال رکھا، اس کے لیے خدا سے بہت کچھ مانگا اور لیا۔ کیا ہم ذکرِ معراج النبیؐ میں آقاؐ کے کرم کو یاد رکھیں گے اور ایسے اقدام کریں گے کہ آقاؐ ہمیں قیامت کے دن اپنا قرار دیں۔

سرکار صلے اللہ علیہ وسلّم کا شہر

مدینۃ النبی صلے اللہ علیہ وسلّم کا ذکر آتے ہی اہلِ محبت آنکھوں کی راہ سے ہدیۂ دل پیش کرنے لگتے ہیں اور جن کی آنکھیں اشکِ مہجوری سے وضو کرتی دکھائی دیں، وہ دراصل طیبۂ مقدسہ میں نمازِ عشق ادا کر رہے ہوتے ہیں اور جو لوگ سرکار صلی اللہ علیہ وسلّم کے شہر میں نمازِ عشق ادا کرنے کا داعیہ رکھتے ہوں، وہ ازلی حقیقتوں تک رسائی کر لیتے ہیں اور جن کی نظر ازلی حقیقتوں کو دیکھ لیتی ہے، وہ حقیقتِ محمدیہ تک پہنچنے کے سلسلے میں اپنی بے بضاعتی کا اعتراف کرنے کو بہت بڑا اعزاز سمجھتے ہیں۔

ہر مسلمان، اگر اس کے ایمان میں کوئی بنیادی خامی نہیں ہے — اگر وہ دل سے اللہ پر اور اُس کے پیارے محبوب صلے اللہ علیہ وسلّم پر ایمان رکھتا ہے، — اور اسے خدا تعالےٰ کے احکام و ارشادات کے برحق ہونے کا یقین ہے تو اسے حضور شافعِ روزِ جزا علیہ التحیۃ والثنا سے بے پناہ محبت ضروری ہے اور جسے محبوب کے در تک پہنچنے کی لگن نہ ہو، وہ محب نہیں۔

حضور رحمتِ ہر عالم صلے اللہ علیہ وسلّم کے دربار گوہر بار میں حاضری کی تمنّا سرکارؐ کے کس نام لیوا کو نہیں۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلّم کا ہر اُمتی اپنے دل کی گہرائیوں میں اس خواہش کو روز بروز پنپتے دیکھتا ہے، کسی کی خواہش پذیرائی کا حُسن پا لیتی ہے اور کسی کی تمنّا میں روز افزوں اضافہ سرکارؐ کو پسند آتا ہے —— اس طرح، آقا حضور صلے اللہ علیہ وسلّم کا کوئی محب اُمتی مدینۃ الرسولؐ میں حاضری کی سعادتوں سے بہرہ یاب ہو جاتا ہے اور کوئی دوسرا محب اُمتی دوری میں بھی یادِ سرکارؐ کے سبب حضوری کی لذتوں میں گم یہ پکارتا دکھائی دیتا ہے۔

دل میرا غمِ ہجرِ مدینہ میں مگن ہے!
اللہ کرے، سب پہ ہو یہ لذّتِ غمِ عام

پھر یا تو سرکارؐ ایسے مجبور کی حالت پر ترس کھا کر اسے اپنے شہرِ پاک میں بُلا بھیجتے ہیں یا اس کی آنکھوں کو یہیں مدینہ بنا دیتے ہیں —— کہ جہاں مجبوبؐ سے محبت کا احساس وصل کی لذّتیں پالے، دید کی سعادتیں حاصل کرلے، وہی درِ محبوب ہے، وہی مستقرِ محبوبؐ ہے اور محبوب و مطلوبِ خلائق (صلے اللہ علیہ وسلم) تو ہر جگہ موجود ہیں۔ آنکھ ان کی یاد میں اتنی مگن، ان کی دید کے خیال سے اتنی پُرامید اور ان کے ذکر میں یوں باوضو ہونی چاہیئے —— اور زبان صلوٰۃ و سلام کے پھولوں کی خوشبو سے اتنی بسی ہوئی ہو —— اور جسم اتنا مطہر ہو، اور مقام اتنا پاکیزہ ہو کہ ممکن ہے سرکارؐ یہیں اپنے محبِّ صادق کی آنکھوں میں قدم رنجہ فرمائیں، یہیں دیدار عطا فرمادیں، یہیں نہال کردیں۔

اگرچہ آقا حضور صلے اللہ علیہ وسلّم نے فرمادیا ہے۔ اَلطَّالِحُ لِی کہ گنہگار میرا ہے اور مجھے اپنے گنہگار، خطاکار، عصیاں شعار ہونے میں کوئی شُبہ نہیں۔ لیکن جب سوچتا ہوں کہ میری آرزوئیں اگر بار پاگئیں، میری تمنائیں برآئیں، میری خواہشیں بارآور ہوئیں اور سرکار صلے اللہ علیہ وسلّم کے دربارِ گوہر بار میں حاضری کی سعادت نصیب ہوگئی تو کون سا مُنہ لے کے جاؤں گا، کس مُنہ سے اپنے سراپا عصیاں وجود کو اُن کا اُمتی کہوں گا؟ —— تو کلیجہ مُنہ کو آنے لگتا ہے۔ سرکارؐ کے شہر میں حاضری کی تمنّا پھر بھی کم نہیں ہوتی۔ اُس روضۂ پاک کے گرد نثار ہونے کو پھر بھی جی چاہتا ہے! جہاں ستّر ہزار فرشتے صبح اور ستّر ہزار فرشتے شام کو طواف کرتے ہیں۔ لیکن حال یہ ہے کہ گزشتہ برس (۱۹۸۶ء میں) قصور میں حضور نورِ مجسم صلے اللہ علیہ وسلّم کے مُوئے پاک کی زیارت کے خیال سے اپنے عزیز دوست سیّد حامد لطیف اور اپنے بیٹے اظہر محمود کی معیت میں گیا لیکن اس احساس نے مجھے کامیاب نہ ہونے دیا کہ میں کیا مُنہ لے کر کن اعمال کے ساتھ سرکارؐ کے زندہ موئے مُبارک کی زیارت کرنے آگیا ہوں۔ وہ سامنے سرکارؐ کا مُوئے مُبارک

مجھے ملاحظہ فرما رہا ہے۔ مجھ پر سرکارؐ کے مُوئے مبارک کی نظر ہے۔ میں اپنے اعمال کے ساتھ اس مقدّس و مطہر بالِ مُبارک کے سامنے ہوں۔ یقین جانیئے، لوگ نو درود دو دو کے ڈونگرے اور سلاموں کے گجرے پیش کر رہے تھے اور میں رو رو کر پاگل ہو رہا تھا۔

گناہوں سے لدے پھندے اعمال کے دفتر لے کر مدینۃ النبی صلے اللہ علیہ وسلّم میں حاضری کی تمنا ایک جسارت ہے۔ پتا نہیں، وہاں کیا ہو۔ جی تو چاہتا ہے کہ شہیدِ گنبدِ اخضر کرامت علی خاں شہیدیؒ کا حُسنِ عاقبت نصیب ہو۔ شہیدیؒ نے کہا تھا:

تمنا ہے، درختوں پر ترے روضے کے جا بیٹھے
قفس جس وقت ٹوٹے طائرِ روحِ مقیّد کا

اور یہ سچا عاشقِ رسولؐ جب مدینے پہنچا، اس کی نظر گنبدِ اخضر پر پڑی، خود ابھی وہاں تک نہیں پہنچا تھا کہ اس کی رُوح کا طائر اس کے جسم کا ساتھ چھوڑ کر روضے کے درختوں کی جانب پرواز کر گیا۔ شہیدی کی کیفیت اور تھی، میں تو اس لیے یہ چاہتا ہوں کہ میرا جسم اپنی عصیاں شعاریوں اور ناکردہ کاریوں سمیت، اپنی نگاہوں سے گنبدِ اخضر کی زیارت کرے، اور بس۔ پھر میں اس قابل نہ رہوں کہ اپنی آلودگیوں سمیت اس پاک روضے کی حدود میں داخل ہو سکوں۔ سرکارؐ ملاحظہ فرمالیں کہ ایک گنہگار اُن کا تھا، مگر اسے اپنے گناہوں کا احساس تھا، اس لیے صرف اپنی گنہگار آنکھوں کو گنبدِ اخضر پر نچھاور کر سکا، اپنے آلودۂ معصیت جسم کو روضے کی حدود میں نہیں لا پایا کہ اُسے اس بارگاہِ عظمت کی تقدیس کا شدید احساس تھا۔ اسی احساس کے پیشِ نظر حکیم الامّت علامہ محمد اقبالؒ نے کہا تھا:

؎ بپایاں چوں رسد ایں عالمِ پیر
شود بے پردہ ہر پوشیدہ تقدیر
مکن رُسوا حضورِ خواجہؐ مارا
حسابِ من ز چشمِ او نہاں گیر!

——— کہ آقا حضور صلے اللہ علیہ وسلّم کی بارگاہ میں اپنے گناہوں کی گٹھڑیاں پیش ہوتے دیکھنا بہت مشکل کام ہے مگر یہ تو میں نے اپنی باتیں شروع کر دیں. میں اس مضمون میں حضور حبیب ربّ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے شہرِ پاک کے ذکر سے اپنی رُوح و جان کو مجلّی کرنا چاہتا تھا.

مدینۂ منوّرہ کی عظمتیں سرکارِ والا تبار صلی اللہ علیہ وسلّم کے دم قدم سے ہیں لیکن یہ شہر خدا تعالیٰ کا محبوب اور پسندیدہ ہے آقا حضور صلے اللہ علیہ وسلّم نے مکّۂ معظمہ سے مدینۂ طیبہ کو ہجرت فرماتے وقت ربّ کریم سے دُعا فرمائی "اے اللہ تو نے میری محبوب ترین جگہ سے مجھے ہجرت کرائی. اب تو مجھے اس قطعۂ زمین میں آباد کر جو تجھے سب سے زیادہ محبوب اور پسندیدہ ہو (مستدرک حاکم) چنانچہ معلوم ہوا کہ اللہ تبارک وتعالےٰ کو تمام شہروں میں سب سے پیارا اور محبوب و مرغوب شہر مدینۂ منوّرہ ہے جہاں اُس نے اپنے محبوبؐ کو آباد کیا.

احادیثِ مقدسہ میں مدینۃ النبی (صلے اللہ علیہ وسلّم) کے بہت سے نام ملتے ہیں. مثلاً. طیبہ. طابہ. مدینۃ الرسول. قریۂ رسُول اللہ. بیت الرسول. حرم رسول اللہ. المحبوبہ. المومنہ. المبارکہ. المرحُومہ. المقدسہ. الموافیۃ. ارض اللہ. الایمان. قلب الایمان. دارالایمان و اکالۃ البلدان. اکالۃ القریٰ. البلد. البحرۃ. الجابرہ. الحرم. حسنہ. جزیرۃ العرب. الحصینۃ ——— الخیرہ. الدّار. دارالابرار قبۃ الاسلام. سیّدۃ البلدان. الشافیہ. القاصمہ. العاصمہ. العذرا. العروض. الغرّاء. علتبہ. قریۃ الانصار. مبیّن الحلال والحرام. المجبورہ. المحفوفہ. المحفوظ. مدخل صدق. المرزوقہ. مہاجر الرسُول. المقر. ذات النخل. دار الفتح.

بعض لوگ نا دانستگی میں اس نُورانی بستی کے لیے "یثرب" کا لفظ بھی استعمال کر لیتے ہیں حالانکہ اس سے منع فرمایا گیا ہے. زمانۂ جاہلیت میں اس کا نام یثرب ہی تھا. بعض لکھتے ہیں کہ یثرب ایک بُت کا نام تھا. بعض کہتے ہیں یثرب بن قانتہ بن مہلائیل بن ارم بن عبیل بن عوض بن سام بن نوح (علیہ السلام) نے اسے آباد کیا. علامہ سمہودیؒ

نے "خلاصۃ الوفا" میں لکھا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے طوفان کے بعد سب سے پہلے یہیں بستی آباد ہوئی تھی.

"یثرب" کی وجہِ تسمیہ جو بھی ہو، اس لفظ کے مادے میں فساد و ہلاکت کے معنیٰ پائے جاتے ہیں جو خدا تعالےٰ کی محبوب سرزمین کے لیے مناسب نہیں. حضور سیّدِ انام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا (حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے) "مجھے ایسی بستی میں سکونت کا حکم دیا گیا جو دوسری بستیوں کو فنا اور کالعدم کر دے گی، لوگ اس کو "یثرب" کہتے ہیں حالانکہ وہ مدینہ ہے". (صحیحین)

مُسندِ احمد میں حضرت براء بن عازبؓ سے روایت ہے، سرکارؐ نے فرمایا جس نے مدینہ کا نام یثرب لیا، اسے توبہ کرنی چاہیئے. وہ طابہ ہے، وہ طابہ ہے.
وہب بن منبہؓ سے روایت ہے، حضور صلے اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا، خدا کی قسم! مدینہ کے نام اللہ کی کتاب توریت شریف میں طیبہ اور طابہ ہیں.

بُخاری شریف میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں. حضور سرورِ کائنات علیہ السلام والصلوٰۃ نے عظمتِ مدینہ کے ذکر میں فرمایا. "ایمان مدینہ کی طرف اس طرح کھنچ آتا ہے جیسے سانپ اپنے سوراخ کی طرف کھنچ آتا ہے". سب اہلِ محبّت مسلمان مدینۂ طیبہ میں اپنی موت اور تدفین پسند کرتے ہیں تو اس کا سبب سرکارؐ سے اُن کی محبّت ہے اور لوگ یہ خواہش کیوں نہ کریں کہ وہاں تدفین کی عظمت ہی بہت ہے.

مؤطا امام مالک میں حضرت یحییٰ بن سعیدؓ سے مروی ہے کہ مدینہ منورہ میں ایک قبر کھودی جا رہی تھی کہ حضور سیّدِ عالم صلے اللہ علیہ وسلّم کی موجودگی میں ایک شخص نے کہا کہ مومن کے لیے یہ اچھا ٹھکانا نہیں ہے. حضورؐ نے فرمایا "تو نے بہت بُرا کہا". اس شخص نے عرض کیا. یا رسُول اللہ میرا یہ مقصد نہیں تھا میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ شہادت فی سبیل اللہ مومن کے لیے اچھا ٹھکانا ہے. اس کے مقابلے میں گھر پر مرنا اچھا ٹھکانا نہیں. حضور رسولِ کریم علیہ التحیۃ والتسلیم نے فرمایا، "مدینہ کی موت قتل فی سبیل اللہ

جیسی نہیں، بلکہ اس سے افضل ہے اور کوئی قطعۂ زمین ایسا نہیں جہاں مجھے اپنی قبر پسند ہو، سوائے مدینہ کے"۔ مسلم شریف میں حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ آقا حضور صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے۔ اَلْمَدِیْنَۃُ خَیْرٌ لَّھُمْ لَوْ کَانُوْا یَعْلَمُوْنَ یعنی مدینہ منورہ ان لوگوں کے لیے بہتر ہے اگر جانتے ہوں۔ بیہقی میں ارشادِ نبوی ہے۔ "جو شخص مدینہ میں مرنے کی استطاعت رکھتا ہو، اس کو چاہیے کہ مدینہ ہی میں مرے۔ اس لیے کہ جو شخص مدینے میں مرے گا، میں اس کا گواہ اور سفارشی بنوں گا"۔

محبوبِ خالق و مطلوبِ خلائق صلے اللہ علیہ وسلّم نے مدینہ کو حرم قرار دیا۔ مسلم شریف میں ہے۔ سرکار رضی نے فرمایا۔ "الٰہی میں مدینہ کے دو پہاڑوں کے درمیانی حصّے کو باحرمت قرار دیتا ہوں جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کو باحرمت قرار دیا"۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ الٰہی! ابراہیم نے مکہ کو حرم بنایا، میں مدینہ کے دو پہاڑوں کے درمیانی حصّے کو حرم بناتا ہوں، نہ اس میں خون بہایا جائے، نہ لڑائی کے لیے ہتھیار اٹھایا جائے اور نہ اس کے درخت کو کاٹا جائے۔ صرف جانوروں کو چرانے کے لیے درخت استعمال کیے جا سکتے ہیں"۔ مؤطا امام مالک میں بھی مدینہ پاک کو حرم قرار دینے کی حدیث پاک روایت کی گئی ہے۔

اللہ کریم جل شانہٗ نے اپنے محبوب اور پسندیدہ ترین شہر میں اپنے محبوب پاک صلے اللہ علیہ وسلّم کو بسایا، سرکار رضی نے اسے حرم فرمایا، اس میں موت اور تدفین کی عظمت بیان فرمائی اور سرکار اسی مقدّس زمین میں آرام فرما ہیں۔ ان وجوہ سے اس سرزمین کی فضیلت و عظمت میں اضافہ ہوتا گیا ہے۔ اب ہمارے لیے یہ کئی وجوہ سے محترم ٹھہری۔ لیکن سب سے بڑا باعث تو ہمارے آقا و مولا، کائنات کے آقا و مولا علیہ التحیۃ والثنا کا اس سرزمین میں تشریف فرما ہونا ہے۔

اور ہم ایسے گنہگار تو سرکار صلے اللہ علیہ وسلّم نے اپنے کھاتے میں ڈال رکھے ہیں کہ الطالح لی"۔ جن سے کوئی غلطی بھی سرزد ہو جائے، ان کے لیے حکم یہی ہے کہ سرکار کی بارگاہِ بیکس پناہ میں حاضر ہوں۔ سورۃ النسا میں ارشادِ خداوندی ہے۔

وَلَوْ اَنَّھُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَھُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَھُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِیْمًا (اور اگر جب وہ اپنی جانوں پر ظلم کریں تو اے محبوبؐ! تمہارے حضور حاضر ہوں اور پھر اللہ سے معافی چاہیں اور رسولؐ ان کی شفاعت فرمائے تو ضرور اللہ کو بہت توبہ قبول کرنے والا مہربان پائیں)

پھر جب غلطی کرنے والے کسی جرم یا گناہ کے مرتکبین بارگاہِ مصطفویؐ میں حاضر ہو گئے۔ تو اللہ کریم نے اپنے محبوب پاک صلے اللہ علیہ وسلّم کو فرما دیا کہ ایسوں کو رحمت و بخشش کی نوید سنا دیں۔ سورۃ الانعام میں ہے۔ وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِاٰیٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ"۔

(اور جب تمہارے حضور وہ حاضر ہوں جو ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں تو اُن سے فرماؤ، تم پر سلام۔ تمہارے رب نے اپنے ذمہ کرم پر رحمت لازم کر لی ہے کہ تم میں جو کوئی نادانی سے کچھ بُرائی کر بیٹھے، پھر اس کے بعد توبہ کرے اور سنور جائے تو بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے)

چنانچہ جو مومن اپنی غلطیوں پر شرمندہ، توبہ کرتا ہوا آستانۂ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم پر حاضر ہو گا، اُسے حضور سیّدِ ہر عالم صلے اللہ علیہ وسلّم کی جانب سے "وسلامٌ علیکم"، کا تحفہ نصیب ہو گا تو اس کی بخشش و غفران میں کیا شک رہ جائے گا۔

وہ شخص تو بہت خوش قسمت ہے جسے مدینۃ النبی صلے اللہ علیہ وسلّم میں حاضری نصیب ہو، اور وہ وہاں سے سرکار رضی کے "سلامٌ علیکم" کا اعزاز حاصل کرے۔ لیکن جب تک وہاں حاضری کی تمنّا پوری نہ ہو، غلطی کے مرتکب مومن کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو دربارِ مصطفویؐ میں حاضر تصوّر کر کے خضوع و خشوع اور محبت و عقیدت کے ساتھ درود و سلام کا نذرانہ پیش کرے۔ احادیثِ مبارکہ میں ہے کہ سرکار اپنے محب اُمتی کے درود و سلام کا جواب عطا فرماتے ہیں۔ یہاں بیٹھے ہوئے بھی آپ کو

آقا حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے "سلامٌ علیکم" کا اعزاز نصیب ہو گیا تو سمجھیے کہ آپ نے غفران و بخشش کی حد کو چھو لیا۔

سرکار صلے اللہ علیہ وسلم کے روضۂ پاک کی زیارت کے قصد سے مدینۂ منورہ میں حاضری دینے سے سرکارؐ کی شفاعت نصیب ہو جاتی ہے۔ دار قطنی میں ہے آقا و مولا علیہ الصلوٰۃ والثناء نے فرمایا، جو شخص میری قبر کی زیارت کرے، اس کے لیے میری سفارش لازم ہو جاتی ہے۔ من زار قبوری وجبت لہ شفاعتی۔ طبرانی میں حضرت ابنِ عمرؓ سے روایت ہے۔ سرکارؐ نے فرمایا، جو زائر میرے پاس آئے اور اس کا مقصد محض میری زیارت ہو اور میری زیارت کے علاوہ کوئی اور مقصد نہ ہو، تو میرے لیے لازمی ہے کہ میں اس کا سفارشی (شفیع) بنوں۔

بیہقی میں حضرت انسؓ سے یہ حدیثِ پاک مروی ہے کہ جو شخص ثواب کی نیت سے مدینہ میں میری زیارت کرے، وہ روزِ حشر میرے پڑوس میں ہوگا اور میں اس کا سفارشی ہوں گا۔ سنن ابو داؤد میں ہے، آقا حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، "مدینہ میں میرا گھر ہے، اسی میں میری قبر ہوگی اور ہر مسلمان پر حق ہے کہ وہ اس کی زیارت کرے"۔ دیلمی میں حضرت ابنِ عباسؓ سے یہ حدیث مروی ہے کہ "جس شخص نے مکّہ میں جا کر حج کیا پھر میری مسجد میں میری زیارت کے لیے آیا، اس کے لیے دو حج مقبول لکھے جاتے ہیں"۔ جذب القلوب میں ہے۔ حضرت علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ نے کہا کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جس شخص نے میری موت کے بعد میری قبر کی زیارت کی، اس نے گویا زندگی میں میری زیارت کی اور جس شخص نے میری قبر کی زیارت نہ کی، اس نے مجھ پر ظلم کیا"۔ —— ان احادیثِ مبارکہ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مدینۂ پاک میں حاضر ہو کر روضۂ مقدسہ کی زیارت کرنا خود حضور صلے اللہ علیہ وسلم ہی کی زیارت کرنا ہے اور جو بد بخت مکّہ معظمہ جا کر بھی مدینہ طیبہ میں حاضری کے شرف سے محروم رہتے ہیں اور روضۂ سرکارؐ کی زیارت نہیں کرتے، وہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو ناراض کرتے ہیں اور سرکارؐ کی ناراضی ہی اللہ تعالےٰ

کی ناراضی ہے۔ صحیح مسلم اور سنن نسائی میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے۔ سیدِ ہر انس و جاں صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری مسجد میں ایک نماز، دوسری مساجد میں ادا کی گئی، ہزاروں نمازوں سے زیادہ بہتر ہے سوائے مسجدِ حرام کے۔ اور میں یقیناً آخری نبی ہوں اور میری مسجد نبیوں کی مسجدوں میں سب سے آخری مسجد ہے۔

مسجدِ نبویؐ پہلی مرتبہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی نگرانی میں تیار کروائی اور خود بنفسِ نفیس اس میں کام کیا۔ اس وقت اس کا رقبہ سو مربع گز کے قریب تھا۔ دوسری بار فتحِ خیبر کے بعد سرکارؐ نے اسے از سرِ نو تعمیر کروایا۔ حضرت عثمانؓ نے ایک انصاری کی زمین خرید کر اس میں شامل کر دی۔ اس طرح یہ مسجد شریف ۲۴۷۵ مربع میٹر پر پھیل گئی۔ تیسری بار ۱۷ سنہ ہجری میں سیدنا فاروقِ اعظمؓ کے زمانے میں اس میں ۱۱۰۵ میٹر کا اضافہ ہوا۔ اس تعمیر میں حضرت عباسؓ کا مکان بھی شامل کیا گیا۔

امیر المومنین حضرت فاروقِ اعظمؓ نے وہ پرنالہ اکھڑوا دیا جس کا پانی مسجد میں گرتا تھا اور نمازیوں کو تکلیف ہوتی تھی۔ حضرت عباسؓ نے حضرت عمرؓ کو یاد دلایا کہ یہ پرنالہ تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ سے لگایا تھا۔ یہ سننا تھا کہ حضرت عمرؓ رونے لگے۔ روتے روتے فرمایا کہ اے عمِ رسولؐ! آپ میری پیٹھ پر کھڑے ہو کر پرنالے کو اسی جگہ لگا دیں۔

چوتھی مرتبہ مسجدِ نبویؐ کو حضرت عثمانؓ کی خلافت کے دور میں ۲۹ سنہ ہجری میں ۴۹۶ مربع میٹر کا اضافہ ہوا۔ یہ اضافہ بھی جنوب اور شمال مغرب کی طرف کیا گیا۔ حجرات کے تحفظ کے لیے مشرق کی طرف اضافہ نہیں کیا گیا۔ پانچویں بار ولید بن عبد الملک نے ۸۸ھ میں اضافے کا کام شروع کیا اور ۹۱ھ میں مکمل ہوا۔ اب کے مسجد نبویؐ میں ۲۳۶۹ مربع میٹر کا اضافہ کیا گیا اور امہات المومنین کے حجراتِ مقدسہ بھی مسجد میں شامل کر لیے گئے۔ پھر خلیفہ مہدی عباسی نے ۱۶۱ھ

میں تعمیری کام شروع کیا جو چار سال میں مکمل ہوا۔ اس بار ۲۴۵۰ میٹر کا اضافہ
ہوا۔ ساتویں مرتبہ خلیفہ المستعصم عباسی نے تعمیری کام کیا۔ آٹھویں بار ملک ناصر محمد
بن قلادون نے ۷۰۶ھ میں تعمیر کی۔ ۷۲۹ھ میں برآمدوں کا اضافہ ہوا۔ نویں مرتبہ
تعمیر کا کام ۸۳۱ھ میں اور دسویں مرتبہ چھتوں کی مرمت کا کام ۸۵۲ھ میں ہوا۔
گیارھویں بار ۸۷۹ھ میں ملک اشرف قائتبائی نے تعمیری کام کیا۔ اس دفعہ مسجد
نبویؐ میں ۱۲۰ میٹر کا اضافہ ہوا۔ حجرہ مبارک کی دیواروں پر گنبد بنوایا گیا۔ باب الرحمۃ
کا مینار تعمیر ہوا۔ دو گنبد باب السلام کے سامنے اندر کی جگہ بنوائے گئے۔

بارھویں مرتبہ ۹۲۴ھ میں دیواریں منقش ہوئیں۔ تیرھویں بار سلطان سلیم ثانی
نے ۹۸۰ھ میں یہ کام کیا۔ چودھویں مرتبہ سلطان محمود نے از سر نو قبر انور پر قبہ شریف
بنوایا اور سبز رنگ کرایا۔ پندرھویں مرتبہ سلطان عبد المجید نے ۱۲۹۳ میٹر کا مسجد نبویؐ
میں اضافہ کیا۔ سولھویں دفعہ فخری پاشا نے تعمیر میں حصہ لیا۔ سترھویں مرتبہ ملک عبد العزیز
(سعودی حکومت) نے کتبے چڑھائے۔ اٹھارہویں مرتبہ ۱۳۵۲ھ میں مصر کی حکومت
نے ترمیم و تجدید کا کچھ کام اپنے ذمے لیا۔ انیسویں مرتبہ سعودی حکومت نے ۱۳۶۸ھ
میں توسیع مسجد کا اعلان کیا۔ ۵ شوال ۱۳۷۰ھ کو دیواریں منہدم کیں۔ ۱۳۷۳ھ میں
جدید سنگِ بنیاد رکھا۔ سعودی حکومت کے دور میں مسجد نبویؐ میں ۶۰۲۴ میٹر کا اضافہ
ہوا۔ اس وقت مسجد نبویؐ شریف کا کل رقبہ، ۱۶۳۲۷ مربع میٹر ہے۔

ترکوں نے مسجد نبویؐ کی تعمیر و توسیع میں کیا کیا احتیاطیں کیں، کس محبت اور عقیدت
سے کس طرح کام کیا، یہ ایک محیر العقول کہانی ہے۔ اس کہانی کو کافی تفصیل کے ساتھ
محبت کی زبان میں مشہور ادیب اور شاعر جناب صلاح الدین محمود نے بیان کیا ہے۔
انہی کے الفاظ میں پڑھیے اور سر دھنیے،

"پہلے پہل برسوں تک تو ترکوں کو ہمت نہ ہوئی کہ وہ مسجد نبویؐ کی تعمیر کریں۔ ان
کے نزدیک یہ ایک کائناتی اور انسانی حدود سے ماورا طاقتوں کے بس کا عمل تھا اور وہ
محض انسان تھے۔ مگر جب انسان سچی محبت کرتا ہے تو وہ اپنے آپ سے باہر قدم

دھرنے کی ہمت بھی پا جاتا ہے۔ سو اپنی محبت کی سچائی کے سہارے انہوں نے یہ
کام شروع کرنے کا ارادہ کیا۔ ترکوں نے اپنی وسیع سلطنت اور پھر پورے عالم اسلام
میں اپنے اس ارادے کا اعلان کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے یہ اعلان بھی کیا
کہ اس خصوصی کام کے واسطے ان کو عمارت سازی اور اس سے متعلقہ علوم اور فنون کے
ماہرین درکار ہیں۔ یہ سننا تھا کہ ہندوستان، افغانستان، چین، وسطی ایشیا، ایران،
عراق، شام، مصر، یونان، شمالی اور وسطی افریقہ کے اسلامی خطوں اور نہ جانے عالم اسلام
کے کس کس کونے اور کس کس چپے سے نقشہ نویس، معمار، سنگ تراش، بنیادیں زمین
کی زندہ رگوں تک اتارنے کے ماہر، چھتوں اور سائبانوں کو ہوا میں معلق کرنے کے
ہنرمند، خطاط، پچی کار، شیشہ گر اور شیشہ ساز، کیمیاگر، رنگ ساز اور رنگ شناس
ماہرین فلکیات، ہواؤں کے رخ پر عمارتوں کی دھار کو بٹھانے کے ہنرمند اور نہ جانے
کن کن عیاں اور کیسے کیسے پوشیدہ علوم کے ماہرین، اساتذہ، پیشہ ور اور ہنرمندوں
نے دنیائے اسلام کے گوشے گوشے میں اپنے اہل و عیال کو سمیٹا اور اس ازلی بلاوے
پر قسطنطنیہ کی جانب روانہ ہو گئے، کہیں بے حد دور، ایک چٹیل ریگستان میں جنت
کی کیاری کے کنارے، ان کے رسولؐ کی قیام گاہ پر تعمیر ہونی تھی اور وہ اور ان کے
ہنر اب ہر طرح اس کام کے واسطے وقف تھے۔

ترکوں کو اس والہانہ کیفیت کی ایک حد تک امید تھی، مگر پھر بھی کہا جاتا ہے کہ
اس اجتماعی بے اختیاری اور مکمل اطاعت پر ان تک کو تعجب ضرور ہوا تھا۔ بہرکیف
ان کی تیاریاں بھی مکمل تھیں۔ عثمانی حکومت کی تقریباً ہر شاخ، اعلان سے پہلے ہی
حرکت میں آ چکی تھی اور حکومت کے اہل کار اپنی حدود میں اور سفیر دوسرے اسلامی
ممالک میں اس انداز اور ارادے کے تمام لوگوں کی اعانت کے واسطے تیار تھے۔ ان
اہل کاروں اور سفیروں کو یہ احکامات تھے کہ وہ ان تمام ماہرین اور ان کے ہمراہ
ان کے اہل و عیال کو، اگر وہ چاہیں، تو قسطنطنیہ تک کے راستے میں ہر طرح کی سہولت
فراہم کریں۔ ادھر سلطانِ وقت کے حکم سے قسطنطنیہ سے چند فرسنگ باہر میدان

میں ایک خود کفیل اور کشادہ بستی تیار ہو چکی تھی۔ سو پھر جب ان ہجتائے روزگار لوگوں کے قافلے پہنچنے شروع ہوئے، تو ان کو ان کے روزگار کے اعتبار سے اس نئی بستی کے الگ الگ محلّوں میں بسایا جانے لگا اور حکومت مکمّل طور پہ ان کی کفیل ہوئی۔

اس عمل میں کوئی پندرہ برس گزر گئے، مگر اب یہ یقین سے کہا جا سکتا تھا کہ اس بستی میں اپنے وقتوں کے عظیم ترین فنکار جمع ہو چکے ہیں۔ اب خود سُلطانِ وقت اس نئی بستی میں گیا اور اس نے خاندانی سربراہوں کا اجلاس طلب کر کے منصوبے کا اگلا حصّہ ان کے سامنے رکھا۔ منصوبے کا اگلا حصّہ اس طرح تھا، ہر ہُنرمند اپنے سب سے ہونہار بچّے یا بچوں (اولاد نہ ہونے کی صُورت میں ہونہار ترین شاگرد) کا انتخاب کرے اور اس بچّے کے جوان ہو کر پختہ عمر تک پہنچنے تک اس کے بدن اور لہو میں اپنا مکمّل فن منتقل کر دے۔ ادھر حکومت کا ذمّہ تھا کہ وہ اس دوران اس انداز سے کے اتالیق مقرر کرے کہ وہ ہر بچّے کو پہلے قرآن کریم پڑھائیں اور پھر قرآن حفظ کروائیں۔ ساتھ ساتھ بچّہ شہ سواری بھی سیکھے۔ اس تمام تعلیم، تربیت اور تیاری کے واسطے پچیس برس کا عرصہ مقرّر کیا گیا۔

اس منصوبے پر ہر ایک نے لبّیک کہا اور صبر، محنت، محبّت اور حیرت کا یہ بالکل الوکھا عمل شروع ہُوا۔

چنانچہ پچیس برس بیت گئے اور ان انوکھے ہُنرمندوں کی ایک نئی اور خالص نسل نشوونما پا کر تیار ہو گئی۔ یہ تیس سے چالیس برس عمر کے مخصُوص اور نیک اطوار نوجوانوں کی ایک ایسی جماعت تھی کہ جو محض اپنے اپنے آبائی اور خاندانی فنون ہی میں یکتا اور عنقا نہیں تھے، بلکہ اس جماعت کا ہر فرد حافظِ قرآن اور فعّال مسلمان ہونے کے علاوہ ایک صحت مند نوجوان اور اچھا شہسوار بھی تھا۔ بچپن کے لمحۂ اوّل سے ان کو علم تھا کہ یہ وہ چیدہ لوگ ہیں کہ جن کو ایک روز کہیں، بعید دُور، ایک چٹیل ریگستان میں، جنّت کی کیاری کے کنارے اپنے رسُول ﷺ کی قیام گاہ کے گرد ایک ایسی لاثانی عمارت تعمیر کرنی ہے کہ جو آسمان کی جانب اس زمین کا واحد نشان ہو۔

ترکوں کے اعلانِ اوّل سے لے کر اب تک کوئی تیس برس سے زیادہ بیت چکے تھے، اور مسجدِ نبوی ﷺ کے معمار، جن کی تعداد کوئی پانچ سو کے لگ بھگ بتائی جاتی ہے تیار تھے۔ ایک طرف تو ہُنرمندوں کی یہ جماعت تیار ہو رہی تھی اور دوسری طرف ترک حکومت کے اہلِ کار عمارت کے واسطے ساز و سامان اکٹھا کرنے میں ایک خاص قرینے کے ساتھ مصروف تھے۔ حکومت کے شعبۂ کان کنی کے ماہرین نے خالص اور عمدہ رگ و ریشے کے پتھر کی بالکل نئی کانیں دریافت کیں کہ جن سے صرف ایک بار پتھر حاصل کر کے ان کو ہمیشہ کے واسطے بند کر دیا گیا۔ ان کانوں کی جائے وقوع کو اس حد تک صیغۂ راز میں رکھا گیا کہ آج تک کسی کو علم نہیں ہے کہ مسجدِ نبوی ﷺ میں استعمال ہونے والے پتھر کہاں سے آئے تھے۔ بالکل نئے اور ان چھوئے جنگل دریافت کیے گئے اور ان کو کاٹ کر ان کی لکڑی کو بیس برس تک حجاز کی آب و ہوا میں آسمان تلے موسمایا گیا۔ رنگ سازوں نے عالمِ اسلام میں اُگنے والے درختوں اور خاکی و آبی پودوں سے طرح طرح کے رنگ حاصل کیے اور شیشہ گروں نے شیشہ بنانے کے واسطے حجاز ہی کی ریت استعمال کی۔ پچہ کاری کے قلم ایران سے بن کر آئے، جب کہ خطاطی کے واسطے نیزے دریائے جمنا اور دریائے نیل کے پانیوں کے کنارے اُگائے گئے۔ غرض یہ کہ جب تک ان ہنرمندوں کی جماعت تیار ہوئی، ان ہی کے بزرگوں کی خاص طور پر تیار کردہ ٹولیوں نے عمارتی سامان بھی فراہم کر لیا۔ یہ سارا عمارتی سامان بمع ہُنرمندوں کی جماعت کے نہایت ہی احتیاط سے پہلے خشکی، پھر سمندر اور پھر خشکی کے راستے حجاز کی سرزمین تک پہنچا دیا گیا کہ جہاں مدینے سے چار فرسنگ دُور ایک نئی بستی اس تمام سامان کو رکھنے اور ہُنرمندوں کے تعمیر کے دوران رہنے بسنے کے واسطے پہلے ہی تیار ہو چکی تھی۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر تعمیر مدینے میں ہونی تھی، تو پھر ساز و سامان مدینے ہی میں رکھا جاتا۔ آخر یہ چار فرسنگ (بارہ میل) دُور کیوں؟ اس کی وجہ ترک یہ بتاتے ہیں کہ آخر ایک بہت بڑی عمارت تیار ہونی تھی کہ جس کے واسطے مختلف جسامت کے ہزاروں پتھر کاٹے جانے تھے،

بڑے بڑے پچان ٹھوک ٹھاک کر تیار ہوتے تھے، اس کے علاوہ بھی بہت سے ایسے ضروری عمارتی عمل ہوتے تھے کہ جن میں شور کا بے حد امکان تھا، جبکہ وہ یہ چاہتے تھے کہ عمارت کی تعمیر کے دوران مدینے میں ذرّہ برابر بھی کوئی شور نہ ہو اور جس فضا نے ہمارے رسولؐ کی آنکھیں دیکھیں اور آواز سُنی ہوئی تھی، وہ اپنی حیا، سکون اور وقار قائم رکھے۔

سو ہر ایسا کام کہ جس میں ذرا بھی شور کا امکان تھا، مدینے سے چار فرسنگ کے فاصلے پر ہوا اور پھر ہر چیز کو ضرورت کے مطابق مدینے لے آیا گیا۔ ایک ایک پتھر پہلے وہیں کاٹا گیا اور پھر مدینے لا کر نصب کیا گیا۔ کبھی ایسا بھی ہُوا کہ چنائی کے دوران کسی پتھر کی کٹائی ذرا زیادہ ثابت ہوئی یا کوئی پچان یا جنگلا چھوٹا یا بڑا پڑا، تو اس کو عجلت میں ٹھوک بجا کر وہیں رسولؐ کے سرہانے ٹھیک نہ کیا گیا، بلکہ چار فرسنگ دُور کی بستی لے جا کر اور دُرست کر کے دوبارہ مدینے لایا گیا۔ یہاں یہ بھی یاد رکھیں کہ اس دُور میں ذرائع مواصلات کیا تھے۔ بھاری بوجھ نہایت سُست رفتاری اور صبر سے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جایا جاتا تھا اور انسانی نقل و حمل کے واسطے سب سے تیز رفتار سواری گھوڑے کے علاوہ کوئی اور نہ تھی۔

سو جبکہ سارا عمارتی سامان اپنی خام شکل میں مدینے کے مضافات والی بستی میں پہنچ گیا اور پھر پانچ سو کے لگ بھگ ہُنرمندوں کی جماعت نے بھی اسی بستی میں آن کر سکونت پائی، تو سب کچھ اب اس جماعت کے سُپرد کر دیا گیا۔ اپنے فنون کے استعمال اور اپنے تخلیقی عمل میں یہ فنکار و ہُنرمند بالکل آزاد تھے۔ صرف دو احکامات ان کو دیئے گئے۔ اوّل یہ کہ تعمیر کے لمحۂ اوّل سے لے کر لمحۂ تکمیل تک اس جماعت کا ہر ہُنرمند اپنے کام کے دوران باوضو رہے اور دوم یہ کہ اس دوران وہ ہر لمحہ تلاوتِ قرآن جاری رکھے۔

سو باوضو حافظِ قرآن ہُنرمندوں کی یہ جماعت پُورے پندرہ برس تک مسجدِ نبویؐ کی تعمیر میں مصروف رہی اور پھر ایک صُبح اُن کو مسجدِ نبویؐ کے خلائی نشان کی چوٹی سے

فجر کی اذان نے، زمین سے نہایت ہی بھروسے اور ایمان سے اُگی اس عمارت کے مکمل ہونے کا اعلان کر دیا۔ اب خلا محفوظ بھی تھا اور آزاد بھی۔

یہ عمارت کیسی ہے، کیا ہے، کہاں ہے اور کہاں لے جاتی ہے؟ اس کے بارے میں تو الگ کتاب لکھوں گا۔ یہاں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ یہ عمارت اس جہان میں ہوتے ہوئے بھی اس جہان میں نہیں ہے۔ اپنے آپ میں قائم رہ کر اس عمارت کو تو دیکھو تو یہ کہیں اور ہے۔ اب آپ سے باہر قدم دھر کے اس کو دیکھو تو یہ کہیں اور اور ہم کچھ اور ہیں۔ پتھر، خلا، ہوا، آواز، لحن، نیت، ایمان اور نُور نے مل کر صبر کی ایک نئی بُنت کی ہے۔ متوازی اوقات اگر رنگ برنگ کے دھاگے ہیں تو ان کی بُنت میں بے رنگ کا دھاگہ اس عمارت کا نُور ہے جو کہ اس بنت کو محض معنی ہی نہیں دیتا،

بلکہ اوقات کا ایک دوسرے سے ایک جائز اور مخفی رابطہ بن کر اوقات کو ایک مرکز بھی فراہم کرتا ہے اور اوقات کے اس مرکز سے ہم کو اپنے رسولؐ کی آوازیں آتی ہے کہ جیسے خلا محفُوظ بھی ہو اور آزاد بھی، کہ جیسے آواز پرندہ بھی ہو اور لہو بھی کہ اندھیرے میدانوں میں کبھی نُور کا شجر اُگے تو کبھی نُور کی وادیوں میں اندھیرا خود ایک شجر ہو کر جیسے نُور محض نُور ہی نہ ہو، بلکہ نُور کا منبع بھی ہو۔ سو جب ریاض الجنّۃ میں اس خلا کے خم پر اپنے رسولؐ کے سرہانے بیٹھو تو کشف ہوتا ہے کہ آخر محبّت کے کیا معنی ہیں اور نیّت کی کیا حدود۔ اور پھر وہ بے نام ہُنرمند یاد آتے ہیں کہ جن کو اپنے ہُنر سے اس واسطے محبّت تھی کہ وہ ان کے رسولؐ کے واسطے تھا کہ جنھوں نے اس چٹیل میدان میں اس جنّت کی کیاری کے کنارے اپنے رسولؐ کی قیام گاہ کی حیا، سکون اور حیرت کو قائم رکھتے ہوئے اس عمارت کو اس خلا کے خم پر تعمیر کیا تھا کہ آج اس عمارت میں محض ان کا ہُنر ہی نہیں، بلکہ ان کے ہُنر کا غیب بھی محفُوظ ہے، اور پھر ترکوں کے واسطے دُعا ہمارے پور پور سے بلند ہوتی ہے۔"

(خاکِ حجاز کے نگہبان؛ از صلاح الدین محمود)

نعت کہنے کے لیے لفظوں کو
اپنے اشکوں سے بھگونا ہو گا
حشر میں چاہو جو ہنسنا، یارو
یادِ سرکارؐ میں رونا ہو گا

میرے دل میں کیوں نہ ہو ارضِ مقدس کا خیال
کیوں نہ ہو میرے لبوں پہ آپؐ کی مدح و ثنا
کس لیے بھولوں نہ میں افضل عبادت نعت کو
میں تو ابنِ خانہ زادِ کہنہ ہوں سرکارؐ کا

محشر کا دن ہو سایہ کرے حمد کا لواء
میرا بھی اوج پر ہو مقدر، خدا کرے
صرفِ نظر گناہوں سے کرکے خدا مجھے
توفیقِ مدحِ ساقیٔ کوثرؐ عطا کرے

سرکار صلی اللہ علیہ وسلم کا نظامِ تعلیم و تربیت

اسلام نے تعلیم کو انسان کی بنیادی ضرورت قرار دیا۔ اس دینِ برحق کے علاوہ دُنیا کے کسی دوسرے مذہب یا معاشرے نے علم و تعلیم کو انسانیت کی بنیادی ضرورت تسلیم نہیں کیا۔ اسلام نے مسلمانوں کو انفرادی اور اجتماعی طور پر اس کا پابند کیا ہے کہ مسلم معاشرے کے ہر فرد کو، بلا امتیازِ تذکیر و تانیث، تعلیم دینے کا اہتمام ہو۔ فرد اور معاشرہ —— پھر افراد میں عورت اور مرد، سب کی یہ ذمّہ داری ہے کہ تعلیم کو عام کریں۔ حکومت پر یہ فرض ہے کہ وہ تمام رعایا کی تعلیم کا مناسب انتظام کرے۔ دولت مند اور باثروت اشخاص کے لیے اسلام نے تشویق و تحریک کا اہتمام کیا ہے کہ وہ عام تعلیم کے لیے اپنے وسائلِ دولت کو استعمال میں لائیں۔ ماں باپ پر فرض عائد ہے کہ وہ اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت کے لیے ضروری بندوبست کریں۔ پھر اسلام کے حوالے سے ہر شخص ذاتی طور پر پابند ہے کہ علم حاصل کرے۔

علم ادراکِ حقیقت کا نام ہے۔ کسی چیز کی حقیقت جاننے کے لیے علم اور عقل ضروری ہیں اور ادراکِ حقیقت کی کوشش کے بغیر انسان زندگی کے کسی شعبے میں ترقی نہیں کر سکتا۔ حیاتِ انسانی کے آغاز سے لے کر آخری لمحے تک علم کی ضرورت پڑتی ہے۔ اسی لیے حضور رسولِ کریم علیہ التحیۃ والتسلیم نے فرمایا۔ اطلبو العلم من المھد الی اللحد کہ ماں کی گود سے موت کی آغوش تک علم حاصل کرو۔

قرآنِ حکیم کی رُو سے علم ہی شرفِ انسانیت کی دلیل ہے۔ اسی بنیاد پر انسان کو اشرف المخلوقات قرار دیا گیا۔ ملائکہ نے خدا کے حکم سے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کیا تو خدا تعالیٰ نے اپنے حکم کی وجہ بھی بتا دی کہ حضرت آدم علیہ السلام کو تمام اسماء کی تعلیم دے دی گئی تھی۔ سُورہ "الرحمٰن" میں اللہ تعالےٰ نے اپنی صفت "رحمان" بیان کرکے

انسان کو مختلف ذرائع سے علم عطا کرنے کا ذکر کیا ہے۔ کہیں علّم القرآن کہا گیا ہے اور کہیں علّمہ البیان کہا گیا ہے۔ سورۂ علق میں ایک جگہ علّم بالقلم ارشاد ہوا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ علم روحانی اور وجدانی طریقوں سے بھی حاصل کرو، گفتگو کے ذریعے سے بھی اور لکھنے پڑھنے کی راہ سے بھی۔

حصولِ تعلیم کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ مومن علم و بصیرت کا مالک ہو اور اپنے علم و بصیرت کو عملی زندگی کی اساس بنائے۔ مومن عمل کا پیکر ہونے کے ساتھ ساتھ رضائے الٰہی کا جویا ہو۔ علم محض نظری اور سطحی نہ ہو، اس میں گہرائی اور گیرائی ہو۔ قرآن مجید بار بار تاکید کرتا ہے کہ خدا کی عطا کردہ عقل سے کام لے کر دُنیا کی بنیادی حقیقتوں سے واقفیت حاصل کرو۔ یعنی انسان اپنے آپ کو سمجھے، کائنات اور مظاہرِ کائنات میں غور و فکر کرتا رہے۔ "افلا ینظرون" کہہ کر مسلمانوں کو غور و فکر کی اہمیت سے آگاہ کیا جاتا ہے، تحقیق و تجسس کی تحریک کی جاتی ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ مومن اللہ کے حکم کے مطابق تسخیرِ فطرت کی جدّوجہد کی مصروف ہو، مگر اس ساری کوشش و کاوش میں یہ حقیقت اس کے پیشِ نظر رہے کہ اسے ایک دن اپنے ہر فعل اور عمل کا حساب خالقِ کائنات کو دینا ہے۔

یعنی اہلِ ایمان کے لیے ضروری قرار دیا کہ وہ تعلیم حاصل کریں، اپنے علم اور بصیرت کا دائرہ عمل تک پھیلا دیں، علم کو اپنی زندگیوں پر بھی نافذ کریں اور معاشرے کو بھی اس کی برکات سے نوازیں اور اس دوران میں خدا تعالےٰ کی یاد سے غافل نہ ہوں اور اپنے ہر فعل کے لیے اپنے آپ کو اُس کے سامنے جواب دہ سمجھیں۔ اکبر الہ آبادی نے کہا تھا۔

تم شوق سے کالج میں پھلو، پارک میں پھولو
جائز ہے غباروں میں اڑو، چرخ پہ جھولو
پر ایک سخن بندۂ عاجز کا رہے یاد
اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو!

مقصد یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا دین جو ہر لحاظ سے کامل و اکمل

دین ہے، ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے، وہ اپنے ماننے والوں کو ایسا نظامِ تعلیم دیتا ہے، جس کے بعد مسلمان ایک متوازن زندگی گزارنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ مسلمان تارکِ دُنیا نہیں ہو سکتا، اسے رہبانیت کی تعلیم نہیں دی گئی۔ اسے معاشرے میں رہتے ہوئے زندگی کے رُوحانی پہلوؤں کو زندہ رکھنا ہوتا ہے۔ اسلام مادّی وسائل کو اخلاقی مقاصد کے حصُول کے لیے استعمال کرنے کی تلقین کرتا ہے۔

تربیتِ اخلاق اسلامی نظام کا بُنیادی مقصد ہے اور یہ ہمیشہ تعلیم کا اساسی جُزو رہا ہے۔ سُورۂ بقرہ میں ہے۔ ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ کہ حضور رسُولِ انام علیہ الصلوٰۃ والسلام نفوس کا تزکیہ کرتے ہیں، کتاب کی تعلیم دیتے ہیں اور حکمت کی باتیں سکھاتے ہیں۔ یعنی کتاب کی تعلیم کے ساتھ ساتھ لوگوں کے اخلاق کا تزکیہ کرنا اور حکمت سکھانا بھی پیغمبرانہ شان ہے۔ ضروری ہے کہ تعلیم کے نتیجے کے طور پر متعلم کے اطوار میں شائستگی پیدا ہو اور وہ حسنِ اخلاق کی دولت سے مالامال ہو جائے۔ تعلیم اور تربیتِ اخلاق لازم و ملزوم ہیں۔ ان میں تفریق کا تصور جدید مغربی ذہن کا پیدا کردہ ہے، آقا حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے لائے ہُوئے نظام میں اس کی گنجائش نہیں۔

اسلام سے پہلے دُنیا کی مختلف تہذیبوں میں تعلیم کے مختلف تصور موجود رہے۔ مثلاً سپارٹا کی تعلیم کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ شہریوں کو ایک فوجی ریاست اور اُس کے جُملہ تقاضوں کے لیے تیار کیا جائے۔ افلاطون کا خیال ہے کہ تعلیم کا مقصد انسان کی پُوری شخصیت کی تکمیل ہے۔ سقراط کا خیال ہے انسان اس لیے بُرا ہے کہ اس کو نیکی کا علم نہیں، اگر اس کو نیکی کا علم ہو جائے تو وہ بہتر انسان بن جائے، لہٰذا پہلی بات اپنی جہالت کا اعتراف کرنا ہے۔ قدیم اہل والے انسان کو مردِ میدان اور ایک اچھا شہری بنانا تعلیم کا مقصود سمجھتے تھے۔ لیکن سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کا تصورِ تعلیم و تربیت ہر لحاظ سے ہمہ گیر ہے۔ یہاں اس کے ذریعے فرد کے تزکیۂ نفس اور ارتقائے شعور و احساس کے ساتھ، معاشرے کی تطہیر اور اجتماعی بہبود پیشِ نظر ہے۔ اسلامی

نظامِ تعلیم کا مطمحِ نظر آفاقی اور ہمہ گیر ہے۔ دوسروں کے ہاں تعلیم ایک کاروبار ہے، دنیا کمانے کا ایک ذریعہ ہے۔ اخلاق کی بلندی، بے لوثی اور بے غرضی اُن کے لیے ضروری نہیں۔ لیکن اسلامی معاشرے میں تعلیم و تربیت کا جو انداز ضروری قرار دیا گیا ہے، اس سے معلم اور متعلم دونوں حیوانی سطح سے بلند ہو کر انسانیت کے شرف کو پا لیتے ہیں، ان میں امن پسندی، کم آزاری اور ہمدردی کے احساسات جنم لیتے اور پنپتے ہیں۔ طالب علموں کی اکثریت با اخلاق، وسیع الظرف، اصلاح پسند اور قانع ہوتی ہے۔ اس قسم کے اصلاح یافتہ افراد سے پیغمبرِ اسلام صلے اللہ علیہ وسلم ایک پُر سکون اور محبت و مودت کی بنیادوں پر تعمیرِ معاشرہ دینا چاہتے ہیں۔ جس کے سارے افراد کا مقصود اعلیٰ اخلاقی معیار کا حصول ہو، تمام دینی اور غیر دینی علوم سے واقفیت کے بعد عملی زندگی میں ان کا عمل دخل ہو اور معاشرے کے سب افراد رضائے الٰہی کی سعادت سے بہرہ یاب ہو جائیں۔

اس مقصد کے لیے اسلام نے یہ طریق کار اختیار کیا ہے کہ سب سے پہلے تعلیم کی اہمیت بیان کی، اس کی فضیلتوں کا اعلان کیا، پھر طالب علم کو تعلیم حاصل کرنے کا شوق دلایا، پھر استاد کو تعلیم اور تربیت دینے پر ابھارا۔ اسلامی تصورِ تعلیم میں اوّلیت طالب علم کو ہے۔ آقا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ طلب العلم فریضۃ علیٰ کل مسلم و مسلمۃ کہ علم حاصل کرنا ہر مُسلمان عورت اور مرد پر فرض ہے۔ مطلب ہے کہ حصولِ علم کی ساری ذمہ داری طالب علم پر ہے اور جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، حصولِ علم کی یہ تشویق و طلب ہنگامی اور وقتی نہیں۔ مُسلمان کو پیدائش سے موت تک کے لیے اس طلب کو اختیار کرنا ہے۔ طالب علم کے لیے حصولِ تعلیم کا عزمِ راسخ ضروری ہے۔ وہ کائنات کے رموز پر غور کرے گا، افلا ینظرون الی الابل کیف خلقت والی السماء کیف رفعت والی الجبال کیف نصبت والی الارض کیف سطحت وہ اُونٹ اور دوسرے جانداروں کی خلقت پر بھی غور کرے گا اور اس کے متعلق علوم سیکھے گا۔ آسمانوں کی بلندی، پہاڑوں کے نصب ہونے اور زمین کے مسطوح

ہونے کی حقیقتوں پر بھی غور کرے گا، شمس و قمر کو تسخیر کرے گا، زمین اور پہاڑوں میں مستور خزانوں تک پہنچے گا لیکن مُسلمان ہے اس لیے اس کا بھروسہ توفیقِ الٰہی پر ہوگا اور توفیقِ الٰہی کے حصول کے لیے بنیادی شرط ہے کہ خدا اور رسُولِ خدا (جل شانہ و صلی اللہ علیہ وسلم) کی نافرمانی نہیں کرے گا، اللہ کا بندہ اور پکا مُسلمان ہوگا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ تعالےٰ کہتے ہیں

شَکَوْتُ اِلیٰ وَکِیْعٍ سُوْءَ حِفْظِیْ فَاَوْصَانِیْ اِلیٰ تَرْکِ الْمَعَاصِیْ

فَقَالَ۔ اِنَّ الْعِلْمَ نُوْرٌ مِّنَ الٰہٖ وَنُوْرُ اللّٰہِ لَا یُعْطیٰ لِعَاصِیْ

کہ میں نے امام وکیع سے شکایت کی کہ میں بھول جاتا ہوں، انہوں نے نصیحت فرمائی کہ ترکِ گناہ کو اختیار کروں کیونکہ علم اللہ کا نُور ہے اور اللہ کا نُور اللہ کے نافرمان کے لیے نہیں ہے۔

اسی لیے ضروری ہے کہ طالب علم حصُولِ تعلیم میں خوشنودیٔ رب سے کم کسی چیز کو اپنا مقصد نہ بنائے۔ رضائے الٰہی مطمحِ نظر ہو تو توفیقِ ایزدی کا تمغہ نصیب ہوتا ہے پہلے تو عزمِ راسخ اور بلند ہمتی عطا ہوتی ہے اور اسی سے مشکلات پر قابُو پایا جا سکتا ہے، علم کا گوہرِ مقصد ملتا ہے اور اس علم کو برتنے کی استطاعت عنایت ہوتی ہے۔

حضور فخرِ موجودات علیہ التحیۃ والصلوٰۃ کے دیئے ہوئے نظامِ تعلیم میں طالب علم کے بعد اُستاد کی اہمیت ہے۔ بیہقی میں ہے، حضور حبیبِ کبریا علیہ التحیۃ والثنا نے فرمایا۔ لوگو! پہلے خود علم حاصل کرو، پھر دوسروں کو تعلیم دو۔ ابنِ ماجہ میں ہے، سرکارؐ نے فرمایا۔ اَلْعَالِمُ وَالْمُتَعَلِّمُ شَرِیْکَانِ فِی الْاَجْرِ۔ تعلیم کے اجر و ثواب میں سیکھنے والا اور سکھانے والا دونوں شریک ہیں —— اسلامی نظامِ تعلیم میں اساتذہ معاشرے کی خوبیوں کی پہچان ہیں۔ وہ معلمِ اخلاق ہیں، ان کی پھیلائی ہوئی تعلیم سے معاشرے کی اصلاح ہوتی ہے، افراد کی زندگیاں سنورتی ہیں۔ اسی لیے حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ علم رکھنے والوں کی روشنائی شہدا کے خون سے افضل ہے۔ اسلام میں استاد کی اہمیت اس سے زیادہ کیا ہوگی کہ سرکار صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے بارے میں

فرمایا انما بعثت معلما تحقیق مجھے معلّم بنا کر بھیجا گیا ہے۔

اسلامی نظامِ تعلیم میں دینی اور شرعی علوم فرضِ عین ہیں اور مادی، حیاتیاتی اور نفسیاتی علوم فرضِ کفایہ کے تحت آتے ہیں کہ پورے معاشرے میں کچھ لوگ ان علوم کو جاننے والے ضرور ہوں۔ فرضِ عین اور فرضِ کفایہ علوم کو حاصل کرنے میں جو علوم آلے کے طور پر کام آتے ہیں۔ مثلاً صرف نحو، منطق ریاضی وغیرہ، ان کی تعلیم مستحب ہے اور جن علوم کے مطالعے سے اسلامی نظریۂ حیات کو نہ تقویت پہنچتی ہے، نہ ضعف پہنچتا ہے، ان کا سیکھنا مباح ہے۔

نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ حضور سیدِ عالم صلے اللہ علیہ وسلّم کے نظام میں تعلیم کی اہمیت یہ ہے کہ وہ فرد کی تشکیلِ سیرت بھی کرے اور اس سے معاشرے کی تطہیر بھی عمل میں آئے۔ تعلیم کے ذریعے انسان اپنے خالق و مالک کو پہچانے اور اس کے دیئے ہوئے علم سے اس کی آیات میں غور بھی کرے۔ آسمان کی پہنائیوں اور زمین کی گہرائیوں میں پنہاں شعائر اللہ کی تلاش، تعلیم کے حصول کے بغیر ممکن نہیں۔ جو شخص دائرۂ اسلام میں داخل ہوتا ہے، وہ گویا علم و تعلیم کے گہرے سمندر میں غوّاصی کر کے حکمت کے لولوئے لالا نکالنے پر آمادہ ہے۔ اگر ایسا نہیں تو اس کا دعوئے اسلام لائقِ بحث ہے۔

سرکار صلی اللہ علیہ وسلّم کا منشورِ حرّیت

حضور نورِ مجسّم ہادیٔ اعظم صلے اللہ علیہ وسلّم کا لایا ہوا نظام ہر لحاظ سے مکمل نظامِ حیات ہے اور وہ حیاتِ انسانی کے ہر پہلو کے لیے رہنما ہے اور آقا حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کا اُسوۂ حسنہ ہمارے لیے نمونہ ہے۔ لقد کان لکم فی رسول اللّٰہ اسوۃ حسنۃ۔ حضور فخرِ موجودات علیہ السّلام والصلوٰۃ نے زندگی کے تمام گوشوں میں ہماری رہنمائی فرمادی۔ ہمیں ایک مکمل نظامِ عبادات دیا، معاشرت کے رہنما اُصول دیئے معیشی معاملات اور کاروبارِ حکومت میں اوامر و نواہی مرتب فرما دیئے۔ ہمیں کیا کرنا ہے اور کن کاموں سے احتراز اور اجتناب کرنا ہے، یہ سب کچھ ہم پر روشن کر دیا گیا ہے۔

حضور رحمۃ للعالمین صلے اللہ علیہ وسلّم نے ہمیں ایک کامل و اکمل نظامِ زندگی دیا جس میں خاص طور پر غلامی کی مختلف صورتوں سے ہمیں رہائی بخشی۔ اسلام نے ہمیں آزادی دی ہے، ہر شعبۂ حیات میں مکمل آزادی۔ بس اس آزادی کے سلسلے میں دو ہی قدغنیں ہیں۔ یہ خدا اور رسولؐ کے احکام کے تابع ہو اور اس آزادی سے کسی دوسرے کے حقوق مجروح نہ ہوں۔

خداوندِ قدّوس و کریم جل و عُلا نے سُورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا۔ لقد کرّمنا بنی آدم۔ بے شک ہم نے بنی آدم کو عزّت دی اور بہت سے دیگر پہلوؤں کے ساتھ حرّیت کی دولت سے نواز کر اللہ تعالٰے نے انسان کو قابلِ تکریم بنا دیا ہے۔ اسلام نے ہر فرد کو تمام نوع کی آزادی سے سرفراز فرمایا ہے اور جو معاشرہ مختلف قسم کی قیود میں محبوس تھا، اسے ان قیود سے رہائی عطا فرمائی۔ انسان کسی فرد کا نام نہیں، انسان ایک پوری نوع ہے۔ اس لیے تقسیمِ آزادی کا مرکز اگر کوئی فرد ہوتا تو کبھی عدل قائم نہ

ہو سکتا، مرکزِ تقسیمِ آزادی خود اللہ کریم کی ذات ہے اس لیے اُس کی قائم کردہ حدود میں رہ کر حریت کی برکات سے بہرہ ور ہونے سے یہ نظامِ عدل قائم ہو جاتا ہے جس سے کسی ایک فرد یا گروہ کی آزادی کسی دوسرے فرد یا افراد کے لیے مصیبت اور پریشانی کا موجب نہیں بنتی۔

اسلام ایسا مکمل دین ہے جس میں اُٹھنے بیٹھنے، ملنے جلنے، سونے جاگنے، کھانے پینے، کمانے، خرچ کرنے، تعلیم دینے، تعلیم حاصل کرنے، راعی بننے اور رعایا ہونے ــــ غرض ہر شعبۂ زندگی میں رہنمائی کی گئی ہے اور آداب سکھائے گئے ہیں لیکن اسلام میں محکومی و غلامی کے آداب ہی نہیں بتائے گئے۔ اسلام میں محکومی و غلامی کا تصور ہی نہیں ہے۔ اگر آپ کسی ایسی زمین کے باسی ہیں جہاں کا حکمران مسلمان نہیں تو آپ کے لیے دو ہی صورتیں ہیں، یا اس کے خلاف جہاد کیجئے یا اس دار الحرب سے ہجرت کر جائیے۔

حضور نبی کریم علیہ التحیۃ والتسلیم کی بعثت سے پہلے انسان نے انسان کو براہِ راست غلام بنا رکھا تھا۔ آقا حضورؐ کے ارشادات و فرمودات اور آپ کے اُسوۂ حسنہ نے غلامی کے اس تصور کو پامال کر کے رکھ دیا۔ طے پایا کہ کوئی شخص بالجبر غلام نہیں بنایا جا سکتا، مالک کی شدید سلوکی کی وجہ سے عدالت غلام کو آزاد کر سکتی ہے، غلاموں کو آزاد کرنا بہت سے گناہوں کا کفّارہ قرار دیا گیا۔ صرف یہ شرط دیکھیے کہ غلام کو اس شرط پر رکھ سکتے ہو کہ جو تم کھاؤ وہی اس کو کھلاؤ، جو تم پہنو، وہی اسے پہناؤ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ غلام محترم بن گئے، عالمِ دین بنے، امیر وزیر ہوئے حتیٰ کہ سپہ سالار اور سربراہِ خطۂ زمین بنے۔

عورت کو مرد نے غلام بنا رکھا تھا، سرکارِ ہر عالم صلے اللہ علیہ وسلّم نے اپنے اُسوۂ حسنہ کے ذریعے عورتوں کو مستقل حیثیت عطا کی اور کہا کہ جس طرح مردوں کے عورتوں پر حقوق ہیں، اسی طرح عورتوں کے حقوق مردوں کو ادا کرنا ہیں۔ آقا حضور صلے اللہ علیہ وسلّم نے عورتوں کو دولتِ حریت سے مالا مال فرمایا۔

حضور رسولِ انام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دولت کمانے اور خرچ کرنے کے اصول متعین فرما کر اور گردشِ دولت کے لیے ایک قابلِ عمل اور بہترین نظام دے کر اہلِ اسلام کو سرمایہ داری کی غلامی سے نجات بخشی۔ ذخیرہ اندوزی اور دولت و ثروت جمع کرنے پر قرآن و احادیث میں سخت وعیدیں ہیں ــــ پھر سرکارؐ کے اعلانِ نبوت سے پہلے علم پر اجارہ داری قائم تھی۔ آقا حضورؐ نے اس کا حصول ہر مسلمان مرد اور عورت کے لیے فرض قرار دیا اور حصولِ علم کی راہ میں حائل قیود کو ختم کر دیا۔

حبیبِ کبریا علیہ التحیۃ والثنا نے انسانوں کو ظالمانہ روایات کی ہتھکڑیوں سے آزادی بخشی۔ جابر و مستبد انسان دوسرے انسانوں کو پابہ زنجیر کیے ہوئے تھے، حضورؐ نے انہیں آزادی کا شعور بخشا، مذہبی پیشواؤں احبار و رہبان نے لوگوں کو توہمات کی قید میں ڈال رکھا، حضورؐ نے انہیں رہائی دلائی۔ انسان گوناگوں غلامیوں کا شکار تھا، آقا حضور صلے اللہ علیہ وسلّم کے اُسوۂ مبارکہ نے اسے حریت کی راہ سجھائی۔ دوسروں کی غلامی سے زیادہ انسان خواہشاتِ نفس کا غلام تھا۔ سرکارؐ کے دیئے ہوئے نظامِ اخلاق نے اس کے اندر ایسی جبلّتیں بیدار کر دیں جن کی مدد سے اس نے احتسابِ نفس کیا، تزکیۂ نفس کیا اور اس بہت بڑی غلامی سے آزادی حاصل کر لی۔

پھر ہمارے آقا و مولا صلے اللہ علیہ وسلّم نے ہر زیادتی، ہر ظلم، ہر استبداد، ہر بُرائی سے آزادی کے لیے جہاد کی تلقین کی اور اس جدّوجہد کا شعور بخشا۔ آپ نے ہمیں سیاسی اور معاشی آزادی سے بہرہ مند کیا۔

خداوندِ قدوس و لایزال نے بنی آدم کو لائقِ تکریم بنایا، لقد کرّمنا بنی آدم۔ تو حضور صلے اللہ علیہ وسلّم کی تعلیمات اور آپ کا اُسوۂ حسنہ بھی سارے انسانوں کے لیے رہنما ہے۔ انہوں نے حریت کی دولت سے تمام کائناتِ عالم کو مستفید فرمایا ہے جس جس کو توفیق ہوتی ہے اس مینارۂ نور سے استفادہ کر سکتا ہے۔ غیر مسلم شہریوں کی آزادی کے متعلق سننِ ابوداؤد میں ہے۔ رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا اَلَا مَنْ ظَلَمَ مُعَاهَدًا۔ اَوِ انْتَقَصَهٗ۔ اَوْ كَلَّفَهٗ فَوْقَ طَاقَتِهٖ۔ اَوْ اَخَذَ

مِنْهُ شَیْئًا بِغَیْرِ طِیْبِ نَفْسٍ. فَاَنَا حَجِیْجُہٗ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ. جو مسلمان کسی معاہد (غیر مسلم شہری) پر ظلم کرے گا یا اس کا حق مارے گا یا اس پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ ڈالے گا یا اُس کی کوئی چیز جبراً لے لے گا تو میں قیامت کے دن اس غیر مسلم کا وکیل بن کر کھڑا ہوں گا۔

حضور سرورِ کائنات علیہ السّلام والصلوٰۃ نے دو اہم موقعوں پر تحریر و تقریر میں منشورِ حرّیت دیا، ایک "میثاقِ مدینہ" کی شکل میں تحریری صُورت میں اور دوسرے حجۃ الوداع کے موقع پر خطبے کی صُورت میں۔ آپ نے ان دونوں مواقع پر غلامی کی ہر شکل کی تغلیط فرمائی اور عالم پر اسرارِ غلامی کو فاش کر کے غوامضِ حرّیت آشکارا کر دیئے۔

آزادی کی جو لگن ہمارے آقا و مولا صلے اللہ علیہ وسلّم نے ہمارے دلوں میں لگائی تھی، اسی کے بل پر ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو ہم نے برِّصغیر میں اپنے لیے ایک الگ مملکت حاصل کی۔ ہم اپنے محسن، کائنات کے محسن صلی اللہ علیہ وسلّم کے میلادِ پاک کی محفل میں اُن کے اس احسان کو بھی یاد کرتے ہیں اور ان سے وعدہ کرتے ہیں کہ حزبی مفادات اور خواہشاتِ نفس کی غلامی سے بھی آزادی حاصل کرنے کے لیے جدّوجہد کریں گے، اور پاکستان کی سلامتی اور استحکام کے لیے بھی جان و مال کی قُربانی سے دریغ نہیں کریں گے۔ ان شاء اللہ العزیز۔

سرکار صلی اللہ علیہ وسلم کا قائم کردہ نظامِ اخوّت

بُخاری شریف میں ہے کہ حضور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا، مُسلمان مُسلمان کا بھائی ہے۔ نہ وہ اس پر ظلم کرے، نہ اسے ذلیل کرے۔ اور جو شخص اپنے بھائی کی حاجت پُوری فرمائے گا اور جو ازی کسی مُسلمان کی تکلیف دُور کرے، اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کی تکالیف میں سے ہر تکلیف سے بچائے گا، اور جو شخص مُسلمان کی پردہ پوشی کرے گا، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی پردہ پوشی فرمائے گا۔

حضور فخرِ موجودات علیہ السّلام والصلوٰۃ نے سب سے پہلے اسلامی اخوّت کی نشاندہی فرمائی کہ ہر مُسلمان دوسرے مُسلمان کا بھائی ہے۔ یہاں غیریت اور بے گانگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جب خالق و مالکِ حقیقی جل جلالہٗ اور اس کے محبوب پاک صلی اللہ علیہ وسلّم نے مجھے اور آپ کو بھائی بھائی قرار دے دیا تو پھر ہم دونوں ایک دوسرے کے دُکھ سُکھ کے ساتھی کیوں نہ ہوں گے۔ میری راحت سے آپ کو مسرّت کیوں نہ ہوگی اور آپ کی تکلیف مجھے رنجیدہ کیوں نہ کرے گی۔ میں کسی پریشانی میں مبتلا ہوں گا تو آپ اس دُکھ میں اپنے آپ کو بھی نہ صرف شریک پائیں گے بلکہ اس پریشانی سے نجات کے لیے تگ و دو بھی کریں گے۔ اس طرح ہم دونوں، پھر پُورا معاشرہ محبّت کی سچی تصویر بن جائے گا اور ایک مُسلمان پوری دُنیائے اسلام کے رشتۂ اخوّت در رشت کا گراں قدر موتی ہوگا۔

حضور سیّدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلّم نے رشتۂ اخوّت کو یاد دلا کر اس رشتے کی مقتضیات کو بھی واضح طور پر بیان فرما دیا۔ حکم دے دیا کہ کوئی مُسلمان اپنے کسی مُسلمان بھائی پر نہ ظلم کرے اور نہ اسے ذلیل و رسوا کرے۔ مقصد یہ ہے کہ جو آدمی اپنے کسی مُسلمان بھائی پر ظلم کرتا ہے یا اسے ذلیل کرتا ہے، وہ خدا اور رسول کے حکم کی خلاف ورزی

کا مرتکب ہوتا ہے اور چونکہ سرکارؐ نے مسلمان کو مسلمان کا بھائی قرار دے کر اسے یہ حکم دیا ہے۔ اس لیے اس کی خلاف ورزی کرنے والا، اپنے مسلمان بھائی پر ظلم کرنے والا یا اسے ذلیل و رسوا کرنے والا دائرۂ اسلام سے تجاوز کرنے والا ٹھہرا۔

آقا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمان بھائیوں کے حقوق متعیّن فرما دیئے۔ یہ ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر حق ہے کہ وہ اس پر ظلم نہ کرے۔ کوئی ایسا عمل نہ کرے، جس سے وہ رسوا ہو۔ ساتھ ہی حضور محسنِ کائنات علیہ السّلام والصلوٰۃ نے فرمایا کہ اگر کوئی مسلمان اپنے مسلمان بھائی کی حاجت پوری کرے تو اللہ تبارک وتعالیٰ اس کی حاجت پوری کرے گا۔ اور جو مسلمان کسی دوسرے مسلمان بھائی کی کوئی تکلیف رفع کرے، اللہ تعالیٰ اسے قیامت کی تکلیف سے محفوظ کر دے گا اور جو کوئی اپنے مسلمان بھائی کی پردہ پوشی کا اہتمام کرے، اللہ کریم قیامت کے دن اس کے عیوب کی پردہ پوشی فرمائے گا۔

جب ہر مسلمان دوسرے مسلمان کو بھائی سمجھتا ہو اور ایک عالمی برادری کے رشتے میں منسلک ہو اور اس ناتے سے کوئی مسلمان کسی دوسرے مسلمان بھائی پر ظلم نہ کرتا ہو اور اس کی ذلت و رسوائی کا سبب نہ بنتا ہو تو معاشرے میں محبّت و اخوت کی جو مثالی صورتِ حال پیدا ہوتی ہے، اس میں ہر شخص دوسرے کا احساس کرتا ہے اور دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوتا ہے۔ ایسے میں جب کوئی ایک مسلمان دوسرے بھائی کی حاجت پوری کرتا ہے تو دوسرا بھائی بھی اس کی ہر حاجت پوری کرنے کے لیے ہر وقت کمربستہ رہتا ہے۔ اس طرح ایک دوسرے کی مدد کرنے کی کیفیت تو مستقل ہوتی ہی ہے لیکن اس باہمی اشتراک و تعاون اور مودّت کے نتیجے میں خدا تعالیٰ بھی ان دونوں کی مدد فرماتا ہے اور ایک دوسرے کی حاجت پوری کرنے والے اہلِ اسلام کی حاجتیں خود پوری فرماتا ہے اور جب یہ ذمّہ خود خدائے پاک اٹھائے تو کوئی حاجت پوری نہ ہونے کا کیا سوال رہ سکتا ہے۔

اسی طرح حضور رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ جب ایک مسلمان بھائی

دوسرے بھائی کی تکلیف دور کرنے میں ممد ثابت ہوتا ہے تو گویا وہ اپنے لیے اس بات کا اہتمام کر رہا ہوتا ہے کہ داورِ حشر قیامت کی تکالیف اس کے لیے آسان فرما دے۔ اسلامی معاشرے میں جب ہم ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں، ایک دوسرے کی تکلیف دور کرنے کی سعی کرتے ہیں تو اس طرح جہاں ایک پُرسکون معاشرہ قائم کرتے ہیں، وہاں جہاں آپس میں ایک دوسرے کی امداد کرتے دیکھ کر اللہ کریم یوں خوش ہوتا ہے کہ قیامت کے دن ہماری تکالیف کو راحت میں بدل دیتا ہے۔

پھر سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دُنیا میں جو آدمی دوسرے مسلمان بھائی کی پردہ پوشی کرتا ہے، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی پردہ پوشی فرمائے گا۔ دُنیا میں جب ایک مسلمان دوسرے کی پردہ پوشی کرتا ہے تو ظاہر ہے کہ دوسرا نہ صرف یہ کہ ایسے کسی موقع پر اس کی پردہ پوشی کرے گا، بلکہ دوسرے معاملات میں بھی آپس میں محبت بڑھے گی اور ایک دوسرے کے ساتھ ایثار و تعاون کی فضا قائم ہوگی۔ لیکن آپس میں شریف آدمیوں کی طرح رہنے کا سب سے بڑا فائدہ، اور اصل فائدہ یہ ہے کہ خدائے علیم و خبیر قیامت کو اس آدمی کی پردہ پوشی کرے گا، جو اپنے دوسرے بھائی کی پردہ پوشی کی نیکی کر چکا ہے۔ مؤطا امام مالکؒ میں حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے کہ سرکارؐ نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد سُنایا کہ میری محبّت ان لوگوں کے لیے واجب ہے جو میری وجہ سے آپس میں محبّت کریں۔

اس حدیثِ پاک سے اسلامی اخوّت کی برکات ظاہر ہوتی ہیں۔ اگر ہم مسلمان ہیں، ہمارا عقیدہ ہے کہ خدا اور رسولؐ نے ہمیں جو جو حکم دیا ہے، اس پر عمل درآمد دنیا و آخرت میں ہماری فلاح کا ضامن ہے اور ہمارا یہ عقیدہ اگرچہ "یؤمنون بالغیب" ہی کی بنیاد پر قائم ہے۔ لیکن اسلام کے ہر حکم کی اساس ایسی ہے کہ ہم ذرا غور و فکر کریں، سوچیں سمجھیں تو ہمارے دماغ کی گرفت سے باہر نہیں ہوتا۔ ہمیں خود خدا اور رسولؐ کے ہر حکم کے اچھے نتائج نظر آسکتے ہیں۔

زیرِ نظر حدیثِ پاک پر عمل کرتے ہوئے اگر ہم آپس میں بھائی بھائی بن جائیں،

ہماری اس اخوت کا دائرہ گفتار سے کردار تک وسیع ہو جائے گا تو لابدی ہو گیا کہ پورے مسلم معاشرے میں کوئی ایک کسی دوسرے پر نہ ظلم کرے گا، نہ اس کو ذلیل و رسوا کرنے کا ارتکاب کریگا ہر مسلمان دوسرے کی حاجت پوری کرنے میں اپنی ساری قوتیں صرف کر دے گا، دوسرے کی تکلیف رفع کرنے کے لیے اپنی سعی کرے گا اور دوسرے کی پردہ پوشی کا اہتمام کرے گا۔ اس طرح ہماری دنیا تو جنت نظیر ہو ہی جائے گی، خود خدا تعالےٰ ہماری حاجتیں پوری فرمائے گا، قیامت کے دن ہمیں تکالیف سے نجات دے گا اور ہماری پردہ پوشی فرمائے گا۔ اسلام کے قربان جائیے کہ ہم دنیوی لحاظ سے شرافتوں کو اپنا لیں، ایک دوسرے کے کام آئیں تو دراصل ہم اپنے خالق و مالک کو اور اس کے محبوب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی خوش کر رہے ہوتے ہیں۔

حلاّل المسائل ـــ سرکار صلی اللہ علیہ وسلم

اللہ کریم نے اپنے محبوب پاک صلے اللہ علیہ وسلم کو اس زمانے میں پیدا کیا، سرکارؐ ایسے عہد میں اس دنیا میں تشریف فرما ہوئے جب تمام کائناتِ عالم پر کفر و شرک کا اندھیرا چھایا ہوا تھا، اچھائیاں عنقا ہو رہی تھیں اور برائیوں نے انسانیت کا احاطہ کر رکھا تھا۔ انسان انفرادی طور پر بھی اور انسانیت مجموعی طور پر بھی مصائب و مشکلات میں گھری ہوئی تھی۔ افراد طرح طرح کے مسائل و مشکلات میں گھرے ہوئے تھے۔ سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ انسان انسان سے نفور تھا، قبیلہ قبیلے سے نبرد آزما تھا اور یہ جھگڑے ختم ہوتے نظر نہیں آتے تھے۔ اس ایک مسئلے سے بہت بڑے بڑے مسائل جنم لیتے تھے اور بہت بڑے بڑے مسائل کا اجتماع اس ایک مسئلے میں ہو گیا تھا۔ لوگ اپنے آپ پر، اپنے کارناموں پر، اپنے آباؤ اجداد کے کارناموں پر، اپنے حسب نسب پر، اپنی نسل پر غرور کرتے تھے۔ اپنے آپ کو بڑا گردانا اور دوسروں کو چھوٹا اور حقیر سمجھنا عظمت کا نشان بن گیا تھا۔ بغض، حسد اور کینہ لوگوں کے دلوں میں گھسا بیٹھا تھا۔ اس وقت پورا معاشرہ گفتار و کردار میں بُعد اور کہنے اور کرنے کی دو عملی میں مبتلا تھا۔ جھوٹ بولنا، دنگا فساد اور جھگڑا کرنا، قتل کا مرتکب ہونا، دوسروں کو اذیت دینا، دوسروں کا مال ناحق کھا جانا اور شراب کو پانی کی طرح استعمال کرنا اور ہر طرح کی خرابیاں اور برائیاں اس معاشرے کا افتخار بن گئی تھیں یہ سب ایسے اعمال ہیں جن کے نتیجے میں انسان انسان کا دشمن بن جاتا ہے، محبتیں عنقا ہو جاتی ہیں، شکر رنجیاں، مخاصمتیں اور دشمنیاں پروان چڑھتی ہیں، محبت و اخوت اور مودّت کے جذبات مر جاتے ہیں اور کسی معاشرے کا روپ کبھی دل خوش کن نہیں ہوتا۔ ایسا معاشرہ سکون و اطمینان کی فضا میں سانس نہیں لے سکتا۔

خداوندِ قدوس و کریم نے دُنیا کو ان بُرائیوں سے محفوظ رکھنے کے لیے اور انسانوں میں محبت اور خلوص کے جذبات پیدا کرنے کی خاطر اپنے پیارے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کو اس دُنیا پر بھیجا۔ سرکارؐ نے اس دنیائے آب و گِل پر تشریف لاتے ہی انسانیت کی بھلائی چاہی۔ حضور رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو ظلم اور بُرائیوں کے محل کے کنگرے گر پڑے، تکبّر اور غرور کے آتش کدے بُجھ گئے، شرک کے مجسمے مُنہ کے بل گر پڑے۔ اصل میں دُنیا کے مسائل حضور سرورِ کائنات علیہ التحیۃ والصلوٰۃ کے اس دنیا میں تشریف لاتے ہی حل ہونے شروع ہو گئے تھے۔

لوگوں کا بچپن غلاظت میں گزرتا تھا، سرکار صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنا پاک صاف بچپن دکھایا۔ لڑکے بالے کوچوں محلوں میں کھیلتے پھرتے تھے، نہ باتوں پر کوئی قدغن نہ کاموں میں اچھے بُرے کی تفریق۔ انہوں نے ایسے اعمال اپنا رکھے تھے، مادر پدر آزادی جن کا طرازِ عنوان تھا۔ ایسے میں آقا حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل سے دُنیا کو خوشگوار حیرت میں مبتلا کر دیا اور لوگ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ عبدالمطلب کا پوتا جس راہ کا راہی ہے، اس میں تو نشیب و فراز نہیں ہیں، یہاں اُونچ نیچ کا کوئی تصوّر ہی نہیں۔ ہم کن اُونچی نیچی جگہوں پر خراب و خستہ حال ہوتے پھر رہے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم عمر کی اس منزل پر پہنچے جس میں لڑکے علم حاصل کرتے ہیں اور اگر پڑھتے لکھتے نہیں تو پھر آوارہ ہو جاتے ہیں، ہیرا پھیری سیکھتے ہیں، بُرے بُرے کاموں میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ لیکن سرکارؐ اپنی زندگی اس طرح دُنیا کے سامنے لائے کہ کسی اُستاد سے علم حاصل نہیں کیا، لیکن کام ایسے اچھے اچھے کیے کہ دُنیا انگشت بدنداں رہ گئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جوانی آئی تو کسی ایک شخص کو بھی شکایت نہ ہوئی۔ دیکھنے والے حیران رہ گئے کہ کبھی جوانی ایسی بے داغ بھی ہوتی ہے۔ ہر اک نے تسلیم کیا کہ اگر کسی جوانی کی قسم کھائی جا سکتی ہے، تو وہ محمد بن عبداللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی جوانی ہے۔

یہ سب کچھ تو دُنیا کے معاشرتی مسائل حل کرنے کی بُنیاد تھی، دُنیا کے اخلاقی مسائل کو حل کرنے کی راہ سُجھائی جا رہی تھی، خدائے واحد کے در پر بندوں کو جُھکانے اور انہیں

بُرائیوں کے گڑھوں سے بچانے کے لیے یہ سب کچھ کیا جا رہا تھا ——— لیکن اس میں بھی لوگوں کو جب کوئی بڑا مسئلہ آن گھیرتا، وہ رہنمائی کے لیے حضور پیغمبرِ اسلام علیہ التحیۃ والسلام ہی کے در پر آ کھڑے ہوتے اور ایسا کرتے تو حل کہاں سے پاتے۔ اصل میں خالق و مالکِ حقیقی جل جلالہٗ اس پُورے معاشرے کو یہ جتا دینا چاہتا تھا کہ سب کو دُنیا اور آخرت کے سب مسائل کے حل کے لیے اسی دروازے پر حاضر ہونا پڑے گا۔ اسی لیے جب حجرِ اسود کو کعبے کی دیوار میں رکھنے کے معاملے میں قبیلے آپس میں سر پھٹول کرنے لگے، اس مسئلے کا حل کسی کی سمجھ میں نہ آیا تو خداوندِ قدوس نے اپنے محبوب پاک صلے اللہ علیہ وسلم کو وہاں بھیج دیا۔ انہوں نے اس مسئلے کو اس خوش اسلوبی سے حل کیا کہ سب حیران رہ گئے اور متاثر تو انہیں ہونا ہی تھا۔

تجارت اور لین دین میں دیانت کا تصوّر عنقا ہوتا جا رہا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت کے اعلان سے پیشتر ہی اس مسئلے کو بھی حل کر دکھایا۔ عملی طور پر تجارت کر کے بتایا کہ اس میں کن چیزوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ اس میں اگر بددیانتی نہ کی جائے، ناپ تول میں کمی نہ ہو، سودا کھرا کھوٹا جیسا بھی ہو گاہک سے چھپایا نہ جائے، معقول منافع لیا جائے، کسی کو دھوکے میں نہ رکھا جائے اور پاک صاف انداز میں لین دین کیا جائے تو نفع کچھ کم نہیں ہوتا۔ پھر ایک دن اپنی پاک زندگی کے چالیس برس سرکارؐ نے لوگوں کے سامنے رکھ کر انہیں دعوت دی کہ کوئی اعتراض کریں، کسی خامی کی نشاندہی کریں، انہیں کوئی کمی یا کوتاہی نظر آتی ہو تو بتائیں۔ کسی کو کوئی خامی نظر آتی ہو تو بتائے۔ چنانچہ سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ ہم میں سے کسی نے آپ کو نہ تو کبھی جھوٹ بولتے سُنا ہے نہ کسی اور بُرائی کے قریب پھٹکتے دیکھا ہے۔ آپ تو ہماری امانتیں سنبھالتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے معاشرے کی عمومی حالت یہ تھی کہ جس کا داؤ لگتا تھا، وہ دوسرے کا مال ہڑپ کر جاتا تھا۔ اس ماحول میں امانت دار تو چشمِ فلک نے پہلی بار دیکھا تھا۔ سب بولے کہ ہم میں سے ہر کسی نے آپ کو چالیس سال تک ہر لحاظ سے پاک صاف دیکھا ہے، آپ کی زندگی تو ہر طرح کی گرد دھول سے پاک شیشہ ہے۔ ان

بتوں کو منوا کر آقا حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی نبوت کا اعلان کیا، لوگوں کو سیدھی
ہ دکھائی۔ یہ بتایا کہ تم بتوں کی پُوجا کر کے اپنے شرفِ انسانیت کی توہین کے مرتکب
تے ہو، عبادت کے لائق تو صرف خالق و مالک حقیقی ہے۔

پھر آہستہ آہستہ لوگ صراطِ مستقیم پر چلنے لگے، اسلام کے حلقہ بگوش ہونے
سرکارؐ کے جاں نثاروں اور نام لیواؤں میں شامل ہونے لگے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم
دنیا کے اخلاقی، معاشرتی، معاشی، سیاسی اور دوسرے مسائل کے حل کی طرف
ی چالیس سالہ زندگی میں جو اشارے کیے تھے یا جس طرح نیکیاں اور اچھائیاں
تھیں، اس کو آگے بڑھاتے ہوئے حضورؐ نے ان تمام مسائل کا حل اپنی پاک تعلیم
ر اپنی پاک سیرت کے ذریعے لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ سرکارؐ کا پیغام پوری دُنیا کے
ے ہے، مسائل ساری دُنیا کے ہیں، ہر زمانے کے ہیں، اسی لیے حضورؐ کو تمام جہانوں
ساری مخلوق کے لیے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے۔ حضورؐ کا پیغام قیامت تک برقرار
ے، حضورؐ کی رحمت بھی تمام جہانوں کی ساری مخلوقات کے لیے قیامت تک برقرار
ہے۔ اب کسی اور پیغمبر کو نہیں آنا ہے۔

پھر حضور رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے انسانوں کے مسائل تو حل فرمائے،
وروں کے مسائل کی طرف بھی آپ نے توجہ فرمائی۔ رحمۃ للعالمین کا معنیٰ ہی یہ ہے
تنی دنیائیں خدا تعالےٰ نے پیدا کی ہیں اور وہ ان کا رب ہے، ان کا پروردگار
ے، اس نے ان سب دنیاؤں اور ان میں قیامت تک کے لیے پیدا کی جانے
ی مخلوق کے سب مسائل کے لیے حضورؐ کو رحمۃ للعالمین بنا دیا ہے۔ کوئی دنیا،
کسی دنیا کی کوئی چیز حضورؐ کی رحمۃ للعالمینی کے دائرے سے باہر نہیں۔ اس کی ایک
ہ مثال ہماری دُنیا کے جانوروں کے مسائل حل کرنے کے سلسلے میں ہمیں دکھا
ی گئی۔ ایک آدمی اپنے اُونٹ سے کام زیادہ لیتا تھا، اسے کھانے کو کم دیتا تھا۔ اونٹ
سب مخلوقات کے محسنِ اعظم صلے اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی اور آپ نے اونٹ
ہ مالک کو سمجھا دیا۔

انسانوں کو تو سرکارؐ نے اُٹھنے بیٹھنے، سونے جاگنے، کھانے پینے، غرض ہر قسم کے مسائل کا حل بتایا۔ عاقبت اور آخرت کے تمام مسائل کا حل سرکارؐ نے اسی دُنیا میں بتا دیا۔ یہاں اچھے کام کرو گے، دوسرے بھائیوں سے اچھا سلوک کرو گے، کسی کو تکلیف نہیں پہنچاؤ گے، کسی کا مال نہیں کھاؤ گے، ان کے دُکھ سُکھ میں شریک ہو گے — تو دنیا میں تو خوشحال اور مطمئن زندگی گزارو گے ہی، قیامت کو بھی حسنِ آخرت کی نوید ملے گی، اور جو فرد یہاں معاشرے کے سکون کو برباد کرتا رہا، لوگوں کو تنگ کرنے کا مرتکب ہُوا، خدا اور رسولؐ کے احکام کو بھولا رہا، اس کی عاقبت تو خراب ہونی ہی ہے، اس دنیا میں بھی بھگتے گا۔

حسنِ معاشرت کا مسئلہ ہو یا معاشی، تعلیمی، اخلاقی، سیاسی مسائل — کوئی مسئلہ بھی ایسا نہیں جس کا حل سرکارؐ نے بتا نہ دیا ہو۔ معیشت کے مسئلے پر آج بھی دنیا پریشان ہے۔ یہ مسئلہ زہریلا ناگ بن کر معاشرے کے سکون کو ڈس رہا ہے۔ لیکن حضورؐ نے اسے یوں حل کر دیا ہے کہ کمائی کی بھی حدود مقرر کر دی ہیں کہ ان طریقوں سے کمانا جائز ہے، ان کرتوتوں سے کمانا جائز نہیں۔ پھر خرچ کرنے کی بھی حدیں مقرر فرما دیں۔ اگر انسان کا خرچ ناجائز نہ ہو تو ناجائز طریقوں سے کمانے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔
پھر خدا اور رسولِ خدا (جل جلالہٗ و صلی اللہ علیہ وسلم) نے مال اکٹھا کرنے پر سخت وعید رکھی ہے۔ زکوٰۃ، خیرات، صدقات، مالی کفارے مال کو جمع کہاں ہونے دیتے ہیں۔ اس طرح دولت کسی ایک ہاتھ میں جمع نہیں ہوتی، تقسیم ہوتی رہتی ہے۔ پھر افلاس اور بھوک کی بات کریں تو حضور سرکارِ دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس مسلمان کا پڑوسی رات کو بھوکا سویا، وہ جنت میں نہیں جائے گا۔ صرف اس ایک حدیثِ پاک پر عمل کرتے ہوئے قانون سازی کی جائے تو دنیا دیکھے گی کہ آج رات ہی پورے ملک میں یا پوری دنیا پر (جہاں جہاں یہ قانون نافذ ہو گا) ایک انسان بھی بھوکا نہیں رہ جائے گا۔
یہ تو صرف معاش کا مسئلہ ہے۔ جس بات کو چھیڑو، دیکھو گے کہ آقا صلے اللہ علیہ وسلم

نے اُس مسئلے کا بھی حل بتا دیا ہے۔ تکلیف دہ حقیقت یہ ہے کہ ہم سرکارؐ کی محبت
کا ذکر بھی کرتے ہیں، ان کے میلادِ مُبارک کی خوشیاں بھی مناتے ہیں، ان کی سیرتِ مُبارکہ
کا ذکر کے نعرے بھی لگوا لیتے ہیں، ان کی سیرتِ طیبہ کے واقعات پڑھتے بھی ہیں، لیکن
جہاں سرکارؐ کی بتائی ہوئی راہ پر گامزن ہونے کی ضرورت ہوتی ہے، وہاں سے نظر
بچا کر گزر جاتے ہیں۔ ورنہ سرکار صلے اللہ علیہ وسلّم کی سیرتِ پاک پڑھ کر دیکھ لو، ان کے
ارشادات و احکام سے واقفیت حاصل کرو، کوئی مسئلہ ایسا نہیں جس کا حل قرآن مجید
اور احادیثِ مُبارکہ میں نہ مل جاتا ہو۔ تم حکومت کرنا چاہو، حکومت یا کسی ادارے کا انتظام
سنبھالنے لگو، میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلّم سے پوچھو، تمہیں معلوم ہو گا کہ کسی عیسائی
سے رہنمائی حاصل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، سرکارؐ بتا چکے ہیں کہ تمہیں کیا کرنا ہے
اور کیسے کرنا ہے۔ روٹی، کپڑا، مکان کا مسئلہ ہو تو کسی یہودی کے در پہ جھولی پھیلانے
کی کوئی حاجت نہیں، سرکارؐ کی احادیثِ مُبارکہ اور آپ کے عمل کی طرف دیکھو۔ دُنیا
کو جنّت بنانا چاہتے ہو تو مل جُل کر زندگی گزارنے کے طریقے سرکارؐ نے بتا دیئے
ہیں۔ معاشرے میں کوئی مسئلہ سامنے آ جائے، محسوس کرو گے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم
پہلے ہی اس قسم کے مسائل کے حل کی راہ سُجھا چکے ہیں۔ بات تو صرف یہ ہے کہ ہم ہر
قسم کے مسائل حل کرنے والے آقا حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی رہنمائی حاصل تو کریں،
اس راہ پر چلیں تو سہی۔

قانونِ مُصطفےٰؐ ہے ہر اک مسئلے کا حل
اس راہ پر چلیں تو سہی، ابتدا تو ہو

سرکار صلی اللہ علیہ وسلّم کا نظامِ حکومت

حضور پُرنُور آقا و مولا علیہ التحیۃ والثنا کے ارشادات و فرمودات، آپ کے
اُسوۂ حسنہ اور آپ کے لائے ہوئے صحیفۂ خداوندی سے، اس حوالے سے واقفیت
حاصل کرنا نہایت مستحسن ہے کہ ہم اس علم کا دائرہ گفتار و سماعت سے کردار و عمل تک
وسیع کر سکیں۔ لیکن یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ہم باتیں کرنا اور باتیں سُننا تو پسند کرتے
ہیں۔ کبھی کبھار پڑھنے کا "جُرم" بھی کر بیٹھتے ہیں لیکن حاصل کیے ہوئے علم کو دل پر
برتنے کا تکلف کم ہی کرتے ہیں۔

اسلام ایک کامل و اکمل دین ہے۔ حضور فخرِ موجودات سرورِ کائنات علیہ السلام
والصلوٰۃ کے اقوال و افعال اسلام کی عملی صُورت ہے۔ آقا حضورؐ نے زندگی کے ہر
شعبے اور حیاتِ انسانی کے ہر زاویے میں رہنمائی فرمائی ہے۔ اگر ہم مسلمان ہیں تو ہمارے
لیے اس امر کی قطعاً گنجائش نہیں کہ عبادت تو ہم محبوبِ کبریا علیہ التحیۃ والثنا کے بتائے
ہوئے طریقے پر کریں اور زندگی گزارنے کے دوسرے عمل میں رہنمائی کے لیے کسی دوسرے
"بڑے" کا مُنہ دیکھیں۔ ہم مذہبی معاملات میں تو اُن کی پیروی کریں اور معیشت کے
لیے کسی یہودی کی دریوزہ گری کریں یا سیاست کے لیے مغرب کی طرف مُنہ کر لیں۔ حضور
رسولِ انام علیہ السلام ایسا مکمل نظامِ حیات لائے ہیں، جس میں کسی پہلو سے کوئی
کمزوری نہیں، جہاں خامی یا کمی کا تصور عنقا ہے —— اور، وہ ایسا نظام بھی نہیں
جس کے کسی ایک پہلو سے تو آپ استفادہ کر لیں اور کسی اور پہلو سے صَرفِ نظر کر لیں۔
اس میں سے اپنی مرضی کا حصّہ لے لیں اور جو آپ کو پسند نہ آئے یا اُس میں کوئی دقت
محسوس ہو، وہ چھوڑ دیں —— مثلاً تعلیم، اخلاق اور معاشرت کو تو خدا اور رسولؐ کے
احکام کے تابع رکھنا چاہیں مگر معاشیات کے اُصول واشنگٹن سے مانگ لیں۔

یا معاشرتی خوبیاں نبیٔ محترم اور ان کے خلفا سے سیکھ لیں اور تعلیم و تعلّم کے اجانچنے کے لیے میکالے کی سمت نگراں ہوں. یا مثلاً باقی زندگی میں تو قرآن و سُنّت کی دہائی دیتے پھریں مگر نظامِ سیاست و حکومت کی بات آئے تو شہنشاہیت، آمریت یا جمہوریت سے محبت کرتے دکھائی دیں ـــــ اسلام کو اپنی مرضی اور مفادات کے مطابق بنا کر پیش کرنے کی کوشش کرنے والے ایسے لوگوں کے لیے سورۂ نسا میں تحوی موجود ہے.

ان الذین یکفرون باللہ ورسلہ ویریدون ان یفرقوا بین اللہ ورسلہ ویقولون نؤمن ببعض ونکفر ببعض ویریدون ان یتخذوا بین ذلک سبیلا ۱۴ اولئک ھم الکفرون حقا واعتدنا للکفرین عذابا مھینا (۴، ۱۵۰،۱۵۱)

(وہ جو اللہ اور اس کے رسولوں کو نہیں مانتے اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کو جدا کر دیں اور نؤمن ببعض ونکفر ببعض کسی حصے پر ایمان لائے اور کسی کے منکر ہوئے اور چاہتے ہیں کہ ایمان اور کفر میں کوئی درمیانی راہ نکال لیں، یہی ٹھیک کافر ہیں اور ہم نے کافروں کے لیے ذلت کا عذاب تیار کر رکھا ہے،

اگر ہم اسلام کے کسی حصے پر تو ایمان لاتے ہیں، اس پر عمل کرنے میں ساعی دکھائی دیتے ہیں لیکن اپنے مفادات کی نگرانی کے حوالے سے کسی دوسرے حصے کا انکار کر دیتے ہیں، اس سے کسی اور نظام کو بہتر گردانتے ہیں تو خدا کے صریح حکم کی رُو سے ہم "کٰفرون حقا" کے مصداق ٹھہرتے ہیں اور خدا کی طرف سے ذلت کے عذاب کی خبر پاتے ہیں.

قرآن پاک کی اس واضح رہنمائی میں آج ہم نبی پاک صاحبِ لولاک صلی اللہ علیہ وسلم کے نظامِ حکومت کا جائزہ لیتے ہیں. اس خیال سے کہ اگر ہمیں اپنے آقا و مولا کا یہ نظام پسند آئے تو اس کے نفاذ و اجرا کے لیے اپنے وسائل کی حد تک آواز اٹھائیں

اور اگر یہ نظام پسند نہ آئے تو اپنے کفر پر مطمئن ہو جائیں.

حضور رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے نظامِ حکومت کی بنیاد یہ ہے کہ دنیا میں کوئی انسان یہ حق نہیں رکھتا کہ کسی دوسرے انسان سے اپنا حکم منوائے. حاکمیت صرف خدائے قدوس و کریم کی ہے، حکومت کا حق صرف اسی کو حاصل ہے.

ان الحکم الا للہ امر الا تعبدوا الا ایاہ ذلک الدین القیم ولکن اکثر الناس لا یعلمون (۱۲: ۴۰)

(حکومت صرف اللہ ہی کے لیے ہے. اس نے فرمایا کہ اس کے سوا کسی کو نہ پوجو یہی سیدھا دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے)

ما لھم من دونہ من ولی ولا یشرک فی حکمہ احدا (۱۸: ۲۶)

(اس کے سوا کوئی کارساز نہیں اور وہ اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں کرتا)

حضور نبیٔ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے نظامِ حکومت میں حقِ حکومت صرف اللہ تعالےٰ کو ہے. بندے کے حاکم ہونے کا کوئی تصور نہیں. اللہ کی حاکمیت کا مطلب اس کے قوانین پر چلنا ہے. یہ قوانین قرآن و سُنّت میں موجود ہیں. حضور کے نظامِ حکومت کے بنیادی تصورات یہ ہیں کہ قانونی اور انتظامی اختیارات خدائے کریم کے لیے ہیں. الملک للہ. الحکم للہ. الارض للہ. خدا و رسولِ خدا نے ہمیں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم دیا. کرنے اور نہ کرنے کے کام بتائے. حضور کے نظامِ حکومت میں سربراہِ حکومت معروف کے عاملین کو جزا دے گا اور منکرات کے مرتکبین کو سزا دے گا. اس طرح اسلامی ریاست، ریاستِ عدل بنے گی ریاستِ حکمرانی نہیں. سورۂ مائدہ میں ہے

یا ایھا الذین آمنوا کونوا قوامین للہ شھداء بالقسط ولا یجرمنکم شنان قوم علی الا تعدلوا اعدلوا ھو اقرب للتقوی واتقوا اللہ ان اللہ خبیر بما تعملون (۸،۵) ـــــ (اے ایمان والو. اللہ کے حکم پر خوب قائم ہو جاؤ، انصاف کے ساتھ گواہی دیتے ـــ اور تم کو کسی قوم کی عداوت اس پر نہ ابھار

کا انصاف نہ کرو. انصاف کرو، وہ پرہیزگاری کے زیادہ قریب ہے اور اللہ سے ڈرو، بے شک اللہ کو تمہارے کاموں کی خبر ہے)

جب سربراہِ مملکت عدل کا اہتمام کرتا ہے تو وہ فرد یا جماعت، قوم اور اس کے افراد کے صحیح حقوق کی نگہداشت کا اہتمام کرتا ہے. بیہقی میں حضرت عمر ابنِ خطاب رضؓ سے روایت ہے، حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خدا تعالےٰ کے نزدیک قیامت کے دن مرتبے کے اعتبار سے، خدا کے بندوں میں سب سے بہتر، عادل اور نرمی کرنے والا حاکم ہے اور بدترین شخص سختی کرنے والا ظالم حاکم ہے. دارمی میں حضرت ابوہریرہ رضؓ کہتے ہیں کہ رسولِ پاک صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا؛ جو شخص دس آدمیوں کا بھی حاکم ہوگا، اسے قیامت کے دن اس حال میں لایا جائے گا کہ اس کی گردن میں طوق ہوگا. اس طوق سے اس کی گردن کو، اس کا عدل ہلکا کرے گا اور اس کا ظلم اسے ہلاک کرے گا.

سرکارِ دو عالم نورِ مجسم صلے اللہ علیہ وسلم کے نظامِ حکومت میں عدالت کا جو ادارہ ہے، اس میں امیر غریب سب کے لیے ایک سا قانون ہے. بخاری شریف میں ہے حضور نے فرمایا. پہلی اُمتیں صرف اس لیے برباد ہوئیں کہ ادنیٰ لوگوں پر قانون کا نفاذ کرتے تھے مگر معزز اور صاحبِ حیثیت لوگوں کو چھوڑ دیتے تھے. مگر حضورؐ کے نظامِ حکومت میں عدل کی صورت یہ بھی ہے کہ خود آپؐ نے مجمعِ عام میں اعلان فرمایا کہ مجھ پر جس کسی کا حق ہو، وہ طلب کرے یا کسی کو مجھ سے تکلیف پہنچی ہو تو بدلہ لے لے.

قرآن مجید میں اللہ اور رسولؐ کے ساتھ ساتھ "اولی الامر" کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے. لیکن حکومت کی اطاعت کا یہ حکم ظاہر ہے کہ خدا و رسولؐ خدا کی اطاعت کے بعد ہے اور حکومت وہی اس لائق ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے، اگر وہ ریاست عدل قائم کرتی ہے. اس کے باوجود کہا گیا کہ اگر کوئی اختلاف یا نزاع پیدا ہو جائے تو اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف رجوع کرنا ہوگا. کیونکہ حاکمِ اصلی خداوند تعالیٰ ہے وراسی کے احکام پہ عمل پیرا ہونا حکومت اور رعایا سب کے لیے لازمی ہے اور

نبی مکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے بارے میں چونکہ ارشادِ ربانی ہے وما ینطق عن الھویٰ. ان ھو الا وحی یوحیٰ کہ وہ وہی بات اپنی مرضی سے کہتے ہیں جو انہیں وحی کی جاتی ہے اس لیے احکامِ خداوندی کا منبع قرآن و احادیث کے فرمودات ہیں. اور کسی تنازع یا اختلاف کی صورت میں انہی فرمودات سے فیصلہ کرانا پڑے گا.

صحیحین میں حضرت ابنِ عمر رضؓ سے روایت ہے حضورؐ نے فرمایا کہ حاکم کا حکم پسند نہ بھی آئے تو بھی اس کی اطاعت فرض ہے. البتہ حاکم کسی گناہ کا حکم دے تو مسلمان پر اس کی اطاعت واجب نہیں. اسی قسم کی ایک حدیث حضرت علی رضؓ سے بھی مروی ہے. صحیح مسلم میں حضرت انس رضؓ کہتے ہیں، رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حاکم کے حکم کو سنو اور اطاعت کرو، اگرچہ تمہارا حاکم کسی حبشی غلام کو بنا دیا جائے جس کا سر انگور کی مانند چھوٹا سا ہو.

مطلب یہ کہ سربراہِ مملکت کے لیے ضروری ہے کہ وہ حاکمیتِ خداوندی کا کارندہ ہو، معروف اور منکر کی جزا و سزا کو نافذ کرے، اسلامی ریاست کو ریاستِ عدل کی صورت دے. ایسی صورت میں اس کی اطاعت مسلمان رعیت کے ہر فرد پہ لازم ہے. اس بات کی کچھ اہمیت نہیں کہ حاکم کی شکل و صورت کیسی ہے یا اس کے کسی حکم کو کوئی پسند کرتا ہے یا نہیں. شرط صرف یہ ہے کہ حکم خدا اور رسولؐ کے احکام کے مطابق ہو. حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے نظامِ حکومت میں اگر کوئی اپنی طرف سے کوئی حکم نافذ کرتا ہے تو وہ شرک کرتا ہے. حکم صرف خدا کا ہے. اسلامی اقتدارِ حکومت کے پاس صرف خدا کی طرف سے امانت کا درجہ رکھتا ہے. صحیحین میں ہے، آقا حضورؐ نے فرمایا کہ اگر حاکم خلافِ شرع بات کہے تو ملتِ اسلامیہ کو اس کا اتباع نہیں کرنا چاہیئے.

اسلام میں سربراہِ حکومت کی اطاعت اُس وقت تک لازم ہے جب تک وہ اللہ کے احکام کے مطابق حکم دے. اگر ایسا نہ ہو تو اسے سیدھا کرنا عوام کا فرض ہو جاتا ہے. جیسا کہ حضرت صدیقِ اکبر رضؓ نے خلافت کے اولین خطبے میں کہا تھا.

اسلامی مملکت قرآن وسنت کے احکام اوران کی متعیّن کردہ جزئیات کو نافذ کرتی ہے۔ احکام اور اُصول تبدیل نہیں ہو سکتے۔ البتہ دنیوی امور طے کرنے کے لیے مشاورت کا حکم ہے۔ وَشَاوِرْھُمْ فِی الْاَمْرِ (۳:۱۵۹) اور وَاَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ (۴۲:۳۸) کا ذکر آلِ عمران اور شوریٰ میں ہے اور حضور صلے اللہ علیہ وسلّم نے خود اس کا اہتمام کیا اور ہمیں اس کا حکم دیا۔ آپؐ تقریباً ہر روز معاملاتِ حکومت میں صحابہؓ سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ سربراہِ مملکت مشورہ اس لیے کرے گا کہ کوئی فیصلہ حاکمِ حقیقی کی مرضی کے خلاف نہ ہو جائے اس لیے مشورہ دینے والے اربابِ فکر و نظر اور اصحابِ علم و دانش ہی ہوں گے۔ محض "جی حضوریے" نہیں ـــــ کہ ان کا کوئی تصور یہاں نہیں ملتا۔

اظہارِ رائے کی آزادی آقا حضورؐ کے لائے ہوئے نظامِ حکومت میں بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اختلافِ رائے ہو سکتا ہے اور ہونا چاہیے کہ حضورؐ نے اُمّت میں اختلاف کے اظہار کو رحمت قرار دیا ہے لیکن یہ اختلاف مغرب کے تصوّرِ اختلاف سے بالکل مختلف ہے۔ ویسٹرن ڈیماکریسی میں you agree to differ لیکن اسلام میں اس کی صورت مختلف ہے۔ یہاں بھی you differ but to agree۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے نظامِ حکومت میں آپ کو اختلاف پیدا ہُوا، آپؐ نے اس کا اظہار کر دیا۔ اختلاف کی وجہ معقول ہے تو دوسرا فریق مان گیا۔ اگر اختلاف کی وجہ غلط فہمی تھی تو وہ دُور کر دی گئی۔ نتیجے کے طور پر دونوں پھر مل کر ایک فلاحی ریاستِ عدل کی ترقی میں لگ گئے۔ حضرت فاروقِ اعظمؓ کے خطبے کے دوران میں ایک صاحب کی نظر ان کی قمیص پر پڑی، اختلاف پیدا ہو گیا۔ انھوں نے اسی وقت اس کا اظہار کر دیا۔ تو خلیفہ نے ان کی زبان بندی یا نظر بندی کے احکام جاری نہیں کیے۔ عبداللہ بن عمرؓ سے کہا، وضاحت کرو۔ انھوں نے بتایا کہ مالِ غنیمت میں سے ملی ہوئی ایک چادر سے خلیفہ کا کُرتہ نہ بنتا تھا، چنانچہ میں نے اپنے حصّے کی چادر بھی انھیں دے دی۔

انھوں نے مالِ غنیمت سے اتنا ہی حصّہ لیا تھا، جتنا دوسرے مسلمانوں کو ملا۔ وضاحت ہو گئی، اختلاف ختم ہو گیا ـــــ کوئی حزبِ اقتدار نہیں رہی، کوئی حزبِ اختلاف نہیں بنی۔

اور اگر اختلاف آپس میں طے نہ ہو تو حضورؐ کے نظامِ حکومت میں اس کا بھی حل ہے۔ سُورۂ نساء میں ہے،

فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ (۴:۵۹)
(اگر تم میں کسی بات کا جھگڑا اُٹھے تو اسے اللہ اور رسُولؐ کے حضور رجوع کرو)

اسی سورت میں کوئی چھ آیت بعد یہ بھی فرما دیا کہ اپنے جھگڑوں کو اپنے طور پر نمٹانے رہنے والے دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتے ہیں۔ مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ رسُولِ پاک صلے اللہ علیہ وسلّم سے اپنے جھگڑوں کا فیصلہ کرائیں اور پھر جو رسولؐ کا فیصلہ ہو، اسے دل سے تسلیم کر لیں۔ فَلَا وَرَبِّکَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَھُمْ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْ اَنْفُسِھِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا۔ (۴:۶۵) ـــــ (اے محبُوب! تمہارے رب کی قسم، وہ مسلمان نہ ہوں گے جب تک اپنے آپس کے جھگڑے میں تمہیں حاکم نہ بنائیں۔ پھر جو کچھ تم فرما دو اپنے دلوں میں اس سے رکاوٹ نہ پائیں اور جی سے مان لیں)

اسلام میں تو اختلاف کی گنجائش بھی محدود ہے چہ جائیکہ فرقہ بندی اور تفرقہ پردازی کو شعار کر لیا جائے۔ اس کام کو تو خدا تعالیٰ شرک قرار دیتا ہے۔ وَلَا تَکُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ مِنَ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَھُمْ وَکَانُوْا شِیَعًا کُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَیْھِمْ فَرِحُوْنَ (۳۰:۳۱،۳۲) تم شرک کرنے والوں میں سے مت ہو جاؤ، یعنی ان میں سے جنھوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور الگ الگ فرقے بن گئے۔ ہر فرقہ اپنے اپنے طریق کار پر نازاں ہے۔ مُسلم شریف میں حضرت عرفجہؓ سے روایت ہے: آقا حضورؐ نے فرمایا کہ عنقریب طرح طرح کے شر اور فسادات رونما ہوں گے۔ پس جو شخص اس اُمّت کے اتحاد و ارتباط میں تفریق پیدا کرے اور

مجتمع امت کے اجتماع کو توڑ دے، اس کی گردن تلوار سے اُڑا دو، خواہ وہ کوئی ہو۔

میں نے شروع میں عرض کیا تھا کہ اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے، اس میں اس کی گنجائش نہیں ہے کہ ہم اپنی مرضی کا حصّہ لے لیں اور جسے اپنے لیے مناسب نہ سمجھیں، اسے چھوڑ دیں۔ اسلام تو مکمل ہے اور کامل و مکمل ہی نافذ ہوتا ہے تو اپنے برگ و بار دیتا ہے۔ اس کا ہر شعبہ دوسرے شعبے کے ساتھ مربُوط و منسلک ہے، اسے الگ الگ کر کے نافذ کیا جائے تو اس کی برکات سے متمتع ہونا ممکن ہی نہیں۔ اور ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہم اسلام کو نعرے کے طور پر استعمال کرتے ہیں؛ جہاں کوئی "لوڑ تھوڑ" آتی ہے، اسے حاجت روائی کے لیے استعمال کر گزرتے ہیں۔ ہم دن رات نبی الانبیا علیہ التحیۃ والثنا کے نظامِ حکومت کی بات بھی کرتے ہیں اور جمہُوریت کے لیے بھی نعرہ زن رہتے ہیں حالانکہ اسلام میں حاکمیت عوام کی تو کیا، خواص کی بھی نہیں، صرف خالق و مالکِ حقیقی کی ہوتی ہے۔ اسلام کے "نظامِ انتخاب" میں تو جو عہدہ طلب کرے، وہ نااہل قرار پاتا ہے۔ بُخاری شریف میں ہے حضرت ابُوموسیٰ اشعریؓ نے فرمایا کہ میں اور میری قوم کے دو آدمی؛ ہم تینوں نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ایک شخص نے کہا، یا رسُول اللہ! صلے اللہ علیک وسلم مجھے امیر مقرر فرما دیجئے، دوسرے نے بھی ایسا ہی کہا۔ آپؐ نے فرمایا کہ ہم اس کو والی نہیں بناتے جو عہدے کا سوال کرے۔ بُخاری شریف کے علاوہ مُسلم، نسائی، مشکوٰۃ میں ایسی بہت سی حدیثیں ہیں جن سے معلُوم ہوتا ہے کہ عہدے کی خواہش کرنا اس کے نااہل ہونے کے مترادف ہے۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلّم کے نظامِ حکومت میں مغربی طرز کی انتخابی مہم بازی کی اجازت نہیں ہے۔ دراصل اسلام کا نظامِ انتخاب عددی ہے ہی نہیں، صفاتی ہے۔ وہاں بندوں کو گنا نہیں جاتا، تولا جاتا ہے۔

فخرِ موجودات علیہ السّلام والصلوٰۃ کے نظامِ حکومت میں شرف و مجدِ انسانیت کی بنیاد پر رعایا کے حقوق متعیّن ہیں۔ یہاں کسی کو کسی پر فوقیت نہیں، سب مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ غلام اور آقا میں فرق نہیں، ہر شخص کی جان و مال و

آبرو محفُوظ ہے۔ یہاں سیاست آلودگیوں سے پاک ہے۔ یہاں انتظامیہ، مقننہ اور عدلیہ کی ذمہ داریاں متعیّن ہیں۔ حکومت طمطراق اور شان و شوکت کا نہیں، سادگی کا نمونہ بنتی ہے۔ اس نظامِ حکومت کا معاشرتی سسٹم جھوٹ، حسد، غیبت، سازشوں اور بُرائیوں سے پاک ہے۔ یہاں کی معیشت ارتکازِ و اکتنازِ زر کی گندگیوں سے منزّہ ہے۔ یہاں کمانے کے طریقے اور اصُول بھی متعیّن ہیں اور خرچ کرنے کی حدیں بھی بتادی گئی ہیں۔ یہ نظامِ معیشت دراصل نظامِ کفالت ہے۔ اسلامی ریاست میں ذرائع پیداوار پر نہ حکومت اپنی اجارہ داری قائم کر سکتی ہے نہ فرد کو یہ حق حاصل ہے۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلّم کے نظامِ حکومت میں انسان کی تکریم اس کے مادی وسائل پر نہیں، اس کے اوصاف و خصائل پر ہے۔ یہاں سربراہِ حکومت کو بھی ملکی وسائل پر صرف اپنے انفرادی حصّے کی حد تک اختیار ہوتا ہے اور اُس پر لازم آتا ہے کہ وہ اپنی روزانہ کی ضرورت سے زیادہ کسی دن بھی اپنے پاس کوئی چیز نہ رکھے —— دُنیا نسل اور قومی تعصّبات کے چنگل میں گرفتار ہے، حضورؐ نے اپنے نظامِ حکومت میں ان تعصّبات کو در آنے کی اجازت ہی نہیں دی۔ سرمایہ دارانہ نظام میں سُود کو مرکزی حیثیت حاصل ہے، اسلام میں یہ مردود ہے۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلّم کے نظامِ حکومت میں اصحابِ فہم و کردار کسی جماعت کو ترتیب دیئے بغیر، اکثریت یا اقلیت کی تقسیم کے تصوّر سے ماورا ہو کر، اور حزبِ اقتدار اور حزبِ اختلاف کے تصوّرات کی تغلیط کر کے مجتمع ہوتے دکھائی دیتے ہیں اور خدا و رسولِ خدا کے احکام کے نفاذ میں ساعی نظر آتے ہیں۔ خدا کی حاکمیت۔ خدا و رسولؐ کے فرمودات پر عمل اور بس!!

نعت محبوبِ خلائق کا صلہ درکار ہے
جو بوصیریؒ کو ملی تھی، وہ ردا درکار ہے

چاہیئے ذکرِ نبیؐ میں گوشۂ چشم آب آب
یادِ طیبہ میں دلِ بھر آشنا درکار ہے!

ہم زبانی ہے خدا کی، نعتِ محبوبِ خدا
مشغلہ یہ مجھ کو ہر صبح و مسا درکار ہے

عافیت کی راہ پر چلنا ہو جس دی فہم کو!
اس کو میرے مصطفیٰؐ کا نقشِ پا درکار ہے

میں بھکاری ہوں تو دریوزہ گری کے واسطے
مالکِ کونین کی دولت سرا درکار ہے!

ضیق میں آئی ہے جاں اب معصیت کے حبس سے
مجھ کو طیبہ کی ہوائے جانفزا درکار ہے

جا کے طیبہ ہی میں پوچھے گا اگر تو پائے گا!
خالق و مالک کا جس کو بھی پتا درکار ہے

تم بھی طیبہ کے کسی گوشے میں جا کر مر رہو
زندگی کی گر تمنا ہے، بقا درکار ہے

چاہتا ہوں میں کہ میری عاقبت محمود ہو
اس لیے توفیقِ مدحِ مصطفیٰؐ درکار ہے

سرکار صلی اللہ علیہ وسلم کا معاشی نظام

حضور سرکارِ دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم نے دُنیا کو ایسا مکمل نظام عطا فرمایا جس میں زندگی گزارنے کے سب طریقے بتائے گئے ہیں۔ اس نظام کا ہر شعبہ دوسرے شعبہ سے پوری طرح منسلک ہے۔ جب ہم آقا حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے بتائے گئے نظامِ معیشت کا ذکر کرتے ہیں تو اس کو دوسرے شعبوں میں دی گئی اسلامی ہدایات سے الگ نہیں کر سکتے۔ آپ اسلام کے تفویض کردہ حقوق و فرائض کو سمجھنے کے لیے مکمل اسلام کو سامنے رکھنے پر مجبور ہیں اور جہاں کوئی شخص کسی ایک شعبے کو دوسرے شعبوں سے الگ کرنے کی کوشش کرتا ہے، وہ اسلام کو سمجھنے میں غلطی کا مرتکب ہوتا ہے۔

حضور سرورِ کائنات علیہ التحیۃ والصلوٰۃ کا قائم کردہ معاشی نظام جہاں قانونی ضوابط رکھتا ہے، وہاں اس کا تعلق انسانی اخلاقیات سے بہت گہرا ہے، بلکہ اس کا زیادہ تر دارومدار ہی اخلاقیات پر ہے اور حقیقت یہ ہے کہ جب بھی کوئی معاشی نظام اخلاق نظام کے علی الرغم جنم لیتا ہے، معاشرے کے اندر انسان اور حیوان میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ معاشی تقاضوں کا عنصر تو انسان اور حیوان میں مشترک ہے اور یہ اخلاقی قدریں ہی ہیں، جن کی بنا پر قائم ہونے والا نظامِ معاش انسان کو اشرف المخلوقات کے بلند ترین منصب اور اعلےٰ ترین مقام پر فائز کرتا ہے۔ جان کی حفاظت، بھوک، پیاس کے ازالے کے لیے پیٹ بھرنا، سردی گرمی کے موسمی اثرات سے محفوظ رہنے کے جذبات، جنسی تقاضوں کی تکمیل، یہ سب باتیں تو حیوانوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔ ضروریاتِ زندگی کی تکمیل میں دوسروں کا خیال رکھنا اور عدل، احسان اور ایثار کی روایات قائم کرنا شرفِ انسانیت کی معراج ہے۔

اسلام کی حقانیت اور ابدیت پر ایمان رکھنے والے کی تین حیثیتیں قرار دی گئی

ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اللہ کا بندہ ہے۔ دوسری یہ کہ وہ بنی نوعِ انسان اور انسانی معاشرے کا ایک فرد ہے اور تیسری یہ کہ خود اس کی اپنی ذات کے کچھ تقاضے ہیں۔ مسلمانوں کی شخصیت ان تینوں حیثیتوں کے امتزاج کا نام ہے اور اسے حقوق اللہ، حقوق العباد اور حقوقِ نفس کو پیشِ نظر رکھنا ہوتا ہے۔ حضور رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کا لایا ہوا نظامِ معاش بھی حقوق کی ان تینوں قسموں کو ادا کرنے سے عمل میں آتا ہے۔ ایک مسلمان کی زندگی کے ہر عمل میں حقوق اللہ کو بہرحال ترجیح ہوتی ہے اور حقوق العباد کی اہمیت صحیح مسلم کی اس حدیث سے ظاہر و باہر ہے۔ حضور حبیب کبریا علیہ التحیۃ والثنا نے فرمایا: "بے شک میری اُمت کا مفلس وہ ہوگا جو قیامت کے دن نماز، روزہ اور زکوٰۃ کے ساتھ آئے لیکن حال یہ ہو کہ اس نے کسی کو گالی دی ہو، کسی پر تہمت لگائی ہو، کسی کا مال کھایا ہو، کسی کا خون بہایا ہو یا کسی کو مارا ہو تو اس کے نیک اعمال میں سے کچھ اس کو دے دیا جائے گا اور کچھ اس کو۔ تو اگر اس کی حسنات ختم ہو جائیں گی قبل اس کے کہ اس پر جو کچھ ہو، ادا کر دیا جائے تو دوسروں کے گناہ اس کے اعمال میں لکھ دیئے جائیں گے۔ پھر وہ جہنم میں جھونک دیا جائے گا۔" اپنے نفس کے بارے میں بھی آقا حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے واضح ہدایات فرمائی ہیں۔ اسلام انسانی نفس کی تمام ضروریات و مقتضیات کو پورا کرنے کی نہ صرف آزادی دیتا ہے بلکہ اس پر اصرار کرتا ہے، بشرطیکہ اس طرح اللہ کی حدود پامال نہ ہوں۔ اسلامی معاشی زندگی میں فرد کو حلال اور جائز ذرائع سے روزی پیدا کرنے کی پوری آزادی ہوتی ہے۔ اسے اپنی جائز کمائی پر ملکیت کا اور اس ملکیت کے انتقال کا حق ہوتا ہے۔ اسلام معاشی جدوجہد کے لیے ترغیب دیتا ہے اور مسلمانوں کو یاد دلاتا ہے کہ کائنات کے تمام وسائل خداوندِ کریم نے انسان کے استفادے کے لیے پیدا کیے ہیں۔ "وہ اللہ ہی ہے جس نے زمین میں جو کچھ ہے سب تمہارے لیے بنایا ہے۔" (البقرہ: ۲۹)۔ "ہم نے تمہیں زمین پر اختیارات کے ساتھ بسایا اور تمہارے لیے سامانِ زیست مہیا کیا۔" (اعراف: ۱۰) "جب نماز پوری ہو جائے تو زمین پر پھیل جاؤ اور اللہ کے فضل سے رزق تلاش کرو۔" (جمعہ: ۱۰) آقا

حضور رسولِ انام علیہ التحیۃ والسلام نے بھی فرمایا: "وسیع مکان، نیک پڑوسی اور عمدہ سواری آدمی کی بہبود میں داخل ہیں۔" (صحیح بخاری) "حلال روزی تلاش کرنا جہاد ہے۔" (کنز العمال) حضرت رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے کاریگر کو اللہ کا دوست قرار دیا ہے اور حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کا ارشاد ہے کہ "صنعت و حرفت جس میں پرہیزگاری کو ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے، فسق و فجور والے سرمائے سے بہتر ہے۔"

غرض اسلام نے ہر فرد کو معاشی جدوجہد پر اکسایا ہے اور کمائی کے طریقوں پر سوائے اس کے کوئی قدغن عائد نہیں کی کہ اللہ کی حدود پامال نہ ہوں، حلال ذرائع سے کمایا جائے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معاشی نظام کے خدوخال

آقا حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے عطا کردہ معاشی نظام کی بنیاد اس تصور پر ہے کہ دولت خواہ کسی شکل میں ہو، اللہ تعالےٰ کی پیدا کردہ ہے اور اصلاً اس کی ملکیت ہے۔ انسان کی ملکیت اللہ کی عطا سے ہے۔ دولت پر انسان کا تصرف احکامِ خداوندی کے تابع ہونا چاہیے۔

اسلام کمائی کے ذرائع میں جائز و ناجائز کی حدود متعین کرتا ہے اور سختی سے ان کی حفاظت کرتا ہے۔ پھر احتکار کی ممانعت کرتا ہے اور ناجائز طریقوں پر خرچ کی روک تھام کرتا ہے۔ عیاشی، قمار بازی، شراب نوشی، بے جا اسراف اور قومی دولت کے ضیاع کے تمام دروازے بند کر دیتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اسلام تقسیمِ دولت کا اہتمام کرتا ہے اور گردشِ زر کا نہایت مؤثر نظام دیتا ہے۔ بڑی بڑی جاگیرداریاں اسلامی معاشی نظام میں ممکن ہی نہیں۔ اسلام معاشی توازن کی صورت میں پیدا کرتا ہے۔ اس نظام میں اُجرتوں کا معیار بھی شخصی کفالت کے اصول پر قائم اور مرتب کیا جاتا ہے۔ اس میں کوئی طبقہ دوسرے طبقے کا استحصال نہیں کر سکتا، وہ اسی

قابل ہی نہیں ہو سکتا، اسلام طبقاتی تقسیم اور طبقاتی منافرت میں یقین نہیں رکھتا بلکہ معاشرے کو محبت، ایثار، خلوص اور مساوات کی بنیادوں پر استوار کرتا ہے۔

مساواتِ اسلامی کی بحث میں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ رزق و مال، علم و جہل اور بعض دوسرے خصائص کے لحاظ سے اسلام نے فطری حد تک امتیاز جائز رکھا ہے اور بعض کو بعض پر رفعت اور تفضیل دی ہے۔ یہ کہنا صحیح نہیں ہو گا کہ آقا حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی قائم کردہ مساوات کا مطلب یہ ہے کہ سب امیر ہوں گے یا سب غریب ہوں گے۔ درجوں اور طبقوں کے بغیر کوئی معاشرہ زندہ ہی نہیں رہ سکتا۔ حضور سرورِ کائنات علیہ السلام والصلوٰۃ نے فرمایا، "زکوٰۃ مسلمانوں کے دولت مندوں سے لی جائے گی اور ان کے غریبوں میں تقسیم کی جائے گی"۔ اسلامی معیشت کا اصول، دولت کی مساوی تقسیم نہیں بلکہ دولت کی منصفانہ تقسیم ہے اور تقسیم دولت کے تمام طریقے زکوٰۃ، صدقات، عشر وغیرہ غریب اور امیر دونوں طبقوں کی موجودگی کی دلیل ہیں، فرق صرف یہ ہے کہ اسلام امیر کو امیر تر اور غریب کو غریب تر ہونے سے روک کر دونوں طبقوں کے درمیانی فاصلے کو کم سے کم کر دیتا ہے اور تھوڑے بہت تفاوت کے ساتھ تمام افراد کی خوشحالی اور معاشی کفالت کا اہتمام کرتا ہے۔ اسلامی معاشی نظام کے قانونی اور اخلاقی تقاضے پورے کرنے کے بعد دولت کے چند ہاتھوں میں مرتکز ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور معاشرے میں نادار و مفلس طبقے کا وجود ممکن ہی نہیں ہے۔

انفرادی ملکیّت

اصلاً خدا تعالےٰ کی حاکمیت و ملکیت کو تسلیم کرنے کے بعد اور اس کی قائم کردہ حدود کے اندر اسلام شخصی و انفرادی ملکیت کو تسلیم کرتا ہے۔ لیکن یہ ملکیت وسائلِ پیداوار سے لے کر اشیائے صرف تک ہر قدم پہ خدا کے احکام کے تابع اور پابند ہے۔ حضور رسولِ انام علیہ الصلوٰۃ والسلام خالق و مالکِ حقیقی جل شانہٗ کا یہ حکم لائے

کہ "ایک دوسرے کے مال ناجائز طریقوں سے نہ کھاؤ۔ ہاں، تمہارے درمیان آپس کی رضامندی سے تجارت ہو تو ٹھیک ہے"۔ (النساء: ۲۹) "کیا یہ لوگ نہیں دیکھتے کہ ہم نے ان کے لیے اپنے ہاتھوں کی بنائی ہوئی چیزوں میں سے مویشی پیدا کیے اور یہ ان کے مالک ہیں (یٰسٓ: ۷۱)

خداوند تعالےٰ نے اپنے محبوب پاک صلے اللہ علیہ وسلم کو فرمایا "اے نبی! ان کے اموال میں سے زکوٰۃ وصول کرو"۔ (التوبہ: ۱۰۳) خود حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اللہ اس مال دار بندے کو محبوب رکھتا ہے جو متقی ہو اور پوشیدہ طور پر خدا کی راہ میں مال خرچ کرتا ہو"۔ (صحیح مسلم)

ناجائز ذرائع آمدن پر قدغن

اسلام فرد کو معاشی جدوجہد کی ترغیب بھی دیتا ہے اور اس کی نجی ملکیت کو بھی تسلیم کرتا ہے، مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ کمائی کے ذرائع کے جائز اور حلال ہونے پر زور دیتا ہے اور حصولِ معاش کی آزادانہ سعی میں حلال و حرام کی حدیں متعین کرتا ہے۔ حرام اور ناجائز ذرائع سے حاصل کی ہوئی دولت کا وہ جائز مالک نہیں ہے۔

خدا اور رسول (جل شانہٗ و صلے اللہ علیہ وسلّم) نے ایسے تمام ذرائع کو ناجائز قرار دیا ہے جن سے خدا کے احکام کی خلاف ورزی ہوتی ہو، دوسرے افراد کو یا اجتماعی طور پر پوری ملت یا ملک یا معاشرے کو اخلاقی یا مادی نقصان پہنچ سکتا ہو یا ایسے تجارتی طریقے جن میں کسی ایک فریق کا یقینی طور پہ فائدہ ہو اور دوسرے فریق کا فائدہ مشتبہ اور مشکوک ہو۔ اتفاق سے، راتوں رات امیر بن جانے کے طریقوں، سٹہ، لاٹری، معمّے وغیرہ سے دولت حاصل کرنا اور دھوکے، جھگڑے اور قیاس کے سودے اور انصاف اور مفادِ عامہ کے خلاف ذرائع حرام قرار دیئے گئے ہیں۔ چنانچہ سود، رشوت، جوا، چوری، سٹہ، خیانت، غصب، غبن، ناپ تول میں کمی، قحبہ گری، شراب اور دوسری منشیات و مسکرات کی صنعت و تجارت

ناجائز منافع خوری، لوٹ مار، مفت خوری، پیشہ ورانہ گداگری اور ظلم و استحصال کے ذرائع سے حاصل ہونے والی دولت کو اسلام ناجائز اور حرام قرار دیتا ہے۔ نیز احتکار اور ایسی اجارہ داریوں سے منع کرتا ہے جن کی وجہ سے عام لوگوں کے لیے مواقع نہ رہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب ایسے تمام ذرائع سے پیدا ہونے والی دولت کے راستے ہی بند کر دیے جائیں تو معاشرے میں کوئی ایسا طبقہ جنم ہی نہیں لے سکتا جو کسی کا استحصال کر سکے اور اگر کوئی شخص کسی طرح ان ناجائز اور حرام ذرائع سے دولت اکٹھی کر ہی لے تو اسلامی ریاست کو اختیار ہے کہ وہ اس کا محاسبہ کرے جیسا کہ خلفائے راشدین کے زمانے میں ہُوا۔

حضرت فاروق اعظمؓ کے زمانے میں "جس وقت کوئی عامل مقرر ہوتا تھا، اس کے پاس جس قدر مال و اسباب ہوتا تھا، اس کی مفصل فہرست تیار کرا کے محفوظ رکھی جاتی تھی اور عامل کی معمولی حالت سے اگر غیر معمولی ترقی ہوتی تھی تو اس سے مواخذہ کیا جاتا تھا۔ ایک دفعہ اکثر عمّال اس بلا میں مبتلا ہوئے خالد بن صعق نے اشعار کے ذریعے حضرت عمرؓ کو اس کی اطلاع دی۔ حضرت عمرؓ نے سب کی موجودات کا جائزہ لے کر آدھا آدھا مال بٹا لیا اور بیت المال میں داخل کر دیا۔" (الفاروق از شبلی نعمانی) اس سے واضح ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست ناجائز طور پر جمع کی ہوئی دولت کو اپنے قبضے میں لے کر مستحقین میں تقسیم کرنے کی مجاز اور ذمہ دار ہے۔

اکتنازِ زر کی ممانعت

آقا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معاشی نظام کی رُو سے جہاں آمدنی کے ذرائع کا حلال اور جائز ہونا ضروری ہے، وہاں ان جائز طور پر دولت کمانے والوں کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی ترغیب موجود ہے۔ "مال کی محبت" کو مذموم قرار دیا گیا ہے اور بخل و امساک، زر پرستی، دولتِ دُنیا کی حرص و ہوس اور خوشحالی پر فخر و ناز

کی مذمت کی گئی ہے۔ قرآن مجید میں ہے۔ "تم لوگوں کو زیادہ سے زیادہ دولت سمیٹنے کی فکر نے مستغرق کر رکھا ہے۔ قبر میں جانے تک تم اسی فکر میں منہمک رہتے ہو۔ یہ ہرگز تمہارے لیے نفع مند نہیں ہے۔ جلد ہی تمہیں اس کا انجام معلوم ہو جائے گا۔" (التکاثر: ۱-۳) "اور جو لوگ سونا چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور اسے خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، انہیں دردناک سزا کی خبر دے دیجئے۔" (التوبہ: ۳۴) "ان لوگوں کو قیامت کے دن اسی مال کے طوق پہنائے جائیں گے جس میں انہوں نے بُخل کیا۔" (آلِ عمران: ۱۷۹)

یاد رہے کہ ارتکازو اکتنازِ زر سرمایہ دارانہ نظام کی جان ہے اور اس کے متعلق قرآنِ مقدس میں اتنا سخت لہجہ اختیار کیا گیا ہے، گویا یہ عمل بھی کفر کی طرح نہایت گھناؤنا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں: "اسلام کے بنائے ہوئے اجتماعی نقشے میں دولت اور وسائلِ دولت کے احتکار و اکتناز کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ احتکار یہ کہ دولت کا کسی ایک طبقے میں محصور ہو جانا۔ اکتناز یہ کہ دولت کے بڑے بڑے خزانوں کا افراد کے پاس جمع ہو جانا۔ اسلام نے سوسائٹی کا جو نقشہ بنایا ہے، اگر ٹھیک ٹھیک قائم ہو جائے اور صرف چند خانے ہی نہیں بلکہ تمام خانے اپنی اپنی جگہ بن جائیں تو ایک ایسا اجتماعی نظام بن جائے گا، جس میں نہ تو بڑے بڑے کروڑپتی ہوں گے، نہ مفلس و محتاج طبقہ۔ ایک طرح کی درمیانی حالت غالب افراد پر طاری ہو جائے گی۔ بلاشُبہ زیادہ سے زیادہ کمانے والے افراد موجود ہوں گے کیونکہ سعی و کسب کے بغیر کوئی مومن زندہ ہی نہیں رہ سکتا۔ لیکن جو فرد جتنا زیادہ کمائے گا، اتنا ہی زیادہ انفاق پر مجبور ہو گا اور اس سے افراد کی کمائی جتنی بڑھتی جائے گی، اتنی ہی زیادہ جماعت بہ حیثیت جماعت کے خوشحال ہو جائے گی۔ قابل و مستعد افراد زیادہ سے زیادہ کمائیں گے لیکن صرف اپنے ہی لیے نہیں کمائیں گے، تمام افرادِ قوم کے لیے کمائیں گے۔ یہ صورت نہ پیدا ہو سکے گی کہ ایک طبقے کی کمائی دوسرے طبقوں کے لیے محتاجی و مفلسی کا پیام ہو جائے

جیساکہ اب عام طور پر ہو رہا ہے۔ اگر مسلمان آج کچھ نہ کریں، صرف زکوٰۃ کا معاملہ ہی احکامِ قرآنی کے مطابق درست کرلیں تو بغیر کسی تامل کے دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ ان کی تمام اجتماعی مشکلات و مصائب کا حل خود بخود پیدا ہو جائے گا۔" (ترجمان القرآن جلد ۲۔ ص ۱۳۱)

خرچ پر تحدید

اسلام نے کسب و عمل کے اصولوں کی طرح صرف اور خرچ کے بھی اصول مقرر کردیے ہیں۔ وہ مسلمان کو پابند کرتا ہے کہ اپنی حلال کمائی کا خرچ بھی حلال اور جائز راستوں ہی پر کرے۔ اسلام نے بے جا خرچ سے منع کیا ہے۔ قرآنِ مجید میں ہے۔ "خرچ میں حد سے نہ گزرو۔ اللہ فضول خرچ لوگوں کو پسند نہیں کرتا۔" (الانعام: ۱۴۱) "فضول خرچی مت کرو۔ فضول خرچ شیطانوں کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا ناشکرا ہے۔" (الاعراف: ۳۱)

حضور محبوبِ ربِّ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کا لایا ہوا دین نہ تو بخل کو پسند کرتا ہے اور نہ فضول خرچی کو۔ اسلام دینِ اعتدال ہے اور اسراف و تبذیر دونوں کی مذمت کرتا ہے اور ان سے منع کرتا ہے۔ غرورِ تبذیر اور شان و شکوہ کے اظہار کے لیے خرچ کرنا، عیاشی اور دوسرے موانعات پر خرچ کرنا اور احکامِ خداوندی کی خلاف ورزی میں خرچ کرنا منع ہے۔ اپنی ذات پر، اہل و عیال پر، قبیلے کنبے والوں، پڑوسیوں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، قرضداروں (غرض ہر انفرادی اور اجتماعی جائز ضرورت) پر خرچ کرنا صحیح اور جائز ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان کو حساس، فراخ دل، فیاض اور خدا خوفی کے احساس سے مملو ہونا چاہیے۔ بے جا خرچ کی باقاعدہ قانون کے ذریعے بھی ممانعت ہے اور اسلام کا نظامِ اخلاق بھی ایسے راستوں پر چلنے سے روکتا ہے اور نیکی پر، خدا کی راہ خرچ کرنے پر اکساتا ہے۔

جب آدمی صرفِ صحیح، جائز اور حلال طریقوں ہی سے روزی کمائے اور اکتناز کی

بھی ممانعت ہو اور خرچ کے سلسلے میں جوئے بازی ممنوع ہو، شراب حرام کردی گئی ہو اور عیاشی کی کوئی خلافِ اخلاق صورت ممکن نہ ہو، سونے چاندی کے برتن اور دکھاوے اور شان و شوکت کے اہتمام (اظہار) پر بھی پابندی ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ اسلام کا نظامِ عبادات اور نظامِ اخلاق اسے انفاق فی سبیل اللہ کی روشنی دکھا رہا ہو تو دولت چند ہاتھوں میں کس طرح سمٹ سکتی ہے اور معاشرے کا کوئی فرد بھوکا، ننگا یا ضروریاتِ زندگی سے محروم کیسے رہ سکتا ہے!

یہاں ایک سوال رہ جاتا ہے کہ خرچ کتنا کیا جائے؟ اس پر قرآن کا حکم یہ ہے "یہ لوگ آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ کتنا خرچ کریں۔ فرمائیے کہ جو تمہاری ضرورت سے زیادہ ہو۔" (البقرہ: ۲۱۹) یعنی ایسا نہ ہو کہ تم بغیر سوچے سمجھے سب کچھ خدا کی راہ میں دے دو اور خود عسرت و نکبت کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاؤ اور اس طرح حقوقِ نفس کے ساتھ اقربا و اعزہ، پڑوسیوں اور کنبے برادری والوں کے حقوق کے بھی غاصب بن جاؤ اور ایسا بھی نہ ہو کہ مال جمع کرتے رہو، گنتے رہو اور ضرورت سے زیادہ دولت کو خرچ نہ کرو۔

تقسیمِ دولت کا مثالی نظام

آقا حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے گردشِ دولت کا ہر طرح سے مکمل اور مثالی نظام ہمیں دیا ہے۔ جب کوئی شخص صرف اور خرچ کے ضمن میں موانعات سے پہلو بچا لیتا ہے اور قرابت داروں، عزیزوں اور محتاجوں کی مدد کرنے پر اپنی حلال کی کمائی ہوئی دولت کو صرف کرتا ہے تو ان اولین حقداروں کے بعد دولت کے ثانوی مستحقین کی امداد کا ایک طویل اور منظم پروگرام بھی اسلام میں موجود ہے۔ ایتائے زکوٰۃ کا ذکر خدا تعالیٰ نے قرآن مجید میں بے شمار مقامات پر نماز کے ساتھ کیا ہے اور ہر صاحبِ نصاب مسلمان پر اسے فرض قرار دیا ہے۔

زمینی پیداوار کا دسواں حصہ "عشر" کے طور پر لینے کا طریقہ اسلام میں موجود ہے۔

اس کی شرح زکوٰۃ سے چار گنا ہے اور اس کا مقصد بھی مفلس و نادار افراد میں وسیع پیمانے پر تقسیمِ دولت ہے۔

اسلام نے بعض گناہوں یا کوتاہیوں کی تلافی کے لیے مالی کفارے بھی مقرر کیے ہیں۔ سورۃ البقرۃ، المائدہ، المجادلہ وغیرہ میں کئی مقامات پر ان کفاروں کا ذکر ہے۔ بعض صورتوں میں یہ کفارے لازمی ہیں، بعض حالات میں اختیاری۔ کفارہ نقد رقم کی صورت میں بھی ہو سکتا ہے اور کھانے کپڑے کے طور پر بھی۔

صدقات کا شعبہ اپنی جگہ پر بہت وسیع ہے، صاحبِ نصاب لوگوں کے لیے صدقۃ الفطر واجب کیا گیا ہے اور چونکہ اس کے نصاب پر پورا سال گزرنا بھی ضروری نہیں، اس لیے اس کا دائرہ زکوٰۃ سے بھی وسیع ہے۔ مقصد یہ ہے کہ عید کے موقع پر زیادہ سے زیادہ مساوات پیدا کی جا سکے۔

اسلام نے ہر انسان پر اپنے خاص خاص رشتے داروں (جن کی فہرست خاصی طویل ہے) کی معاشی کفالت کی ذمّے داری عائد کر دی ہے۔ اجتماعی طور پر اپاہج، کمزور، ضعیف اور معذور افراد کی معاشی کفالت کا انتظام موجود ہے۔

جنگ سے حاصل شدہ اموالِ غنیمت کا پانچواں حصہ جسے "خُمس" کہتے ہیں عام لوگوں کی معاشی بہبود اور خوشحالی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ پھر جنگ کے ختم ہو جانے اور محاذِ جنگ کے دارالاسلام بن جانے کے بعد کفّار سے حاصل ہونے والے مال کو شرعاً مالِ فئی کہا جاتا ہے۔ یہ سارے کا سارا مسلمانوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

اور ——— ان سب اخراجات کے بعد بھی کسی شخص کے پاس اُس کی حلال کمائی سے کچھ دولت بچ جاتی ہے تو وہ آقا حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے قائم کیے ہوئے قانونِ وراثت کے تحت تقسیم کر دیتا ہے۔ تقسیمِ میراث کے قانون کا مقصد ہی یہ ہے کہ جو مال ایک شخص کی زندگی میں یکجا ہو گیا ہو، وہ اس کے مرنے کے بعد اسی صورت میں اکٹھا نہ رہنے دیا جائے، بلکہ اس کے رشتے داروں میں پھیلا دیا جائے۔ چنانچہ دو ایک پشتوں کے بعد امرا کی اولاد دولت سے محروم ہو کر عام لوگوں کی سطح پر آ جاتی ہے اور

اس طرح سرکارؐ کا عطا کردہ نظامِ عدل دولت تقسیم کرتا رہتا ہے۔ انتشارِ دولت کے اس پروگرام کے تحت تمام جائداد اور دولت ورثا میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ قریبی ورثا نہ ملیں تو دُور کے ورثا، اور اگر کوئی شخص لاوارث مرے تو اس کی وراثت ریاست کی معرفت غربا میں تقسیم کر دی جاتی ہے۔ اسلامی اقتصادیات کی اساس ہی تقسیمِ دولت اور گردشِ زر پر ہے اور اسلام کا قانونِ وراثت اس سلسلے کا آخری عمل ہے۔ اور اس طرح شرعِ مبین کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔

کس نہ گردد در جہاں محتاجِ کس
نکتۂ شرعِ مبین این است و بس

ہر خوشی غمی دیکھی، جو بھی شے ہے دُنیا کی
بھول بھول جاتا ہوں، یادداشت ایسی ہے
فصلِ یادِ طیبہ کی پھلتی پھولتی پائی!
حافظے کی کھیتی پر اک یہ کاشت ایسی ہے

سکونِ دل، مسرت اور طمانیت اگر چاہو
اگر چاہو، تمہارا پنڈ چھوڑیں رنجِ دُنیا کے
تو دل کے کینوس پر ذہن کے دستِ تعاون سے
بناؤ گنبدِ اخضر کے ہر صبح و مسا خاکے

ہر اک شے پر اُنہی کو اختیاراتِ مکمل ہیں
کہ ہیں جاگیر یہ سارے زمین و آسماں اُن کی
حقیقت بس یہی شایانِ سرکارِ دو عالم ہے
کہ ہے مدّاح خود ذاتِ خداوندِ جہاں اُن کی

صاحبِ خُلقِ عظیم سرکار صلی اللہ علیہ وسلم

حضور سیّدِ ہر انس و جاں صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کریم جلّ وعلا نے صاحبِ خُلقِ عظیم فرمایا۔ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (سورۂ ن) سرکار نے خود فرمایا کہ مجھے اخلاق کی تکمیل کے لیے مبعوث کیا گیا ہے۔ آپ کی حیاتِ طیبہ اخلاق کا بے نظیر نمونہ تھی۔ صحیح مسلم میں حضرت نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے حضور اکرم الاکرمین شفیع المذنبین رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے نیکی اور گناہ کے متعلق فرمایا کہ نیکی حُسنِ اخلاق ہے اور گناہ وہ ہے جس سے تیرے ضمیر میں خلش پیدا ہو، اور تجھے اس کا لوگوں پر ظاہر ہونا گوارا نہ ہو۔ سُننِ ابوداؤد میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے حضور حبیبِ کبریا علیہ التحیۃ والثنا نے فرمایا کہ ایمان والوں میں زیادہ کامل ایمان والے وہ ہیں جن کے اخلاق زیادہ اچھے ہیں۔

اسلامی تعلیمات کی بنیاد حُسنِ معاشرت ہے۔ خدا اور رسُولِ خدا جلّ جلالہٗ و صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم یہی ہے کہ ہم ایک پُرسکون معاشرہ تعمیر کریں، جس میں شکر رنجیاں، مخاصمتیں، مخالفتیں اور دُشمنیاں نہ ہوں ـــــ اخوت و مروت، اخلاص و ایثار اور عفو و درگزر کا دور دورہ ہو۔ مسلمان محبت کے سائبان تلے طمانیت کی زندگی گزاریں اور رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ کی تصویر بن جائیں۔

ایک متفق علیہ حدیثِ پاک میں ہے، حضور محسنِ کائنات علیہ السلام والصلوٰۃ نے فرمایا کہ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔ نہ وہ اس پر ظلم کرے، نہ اسے ذلیل کرے، اور جو شخص اپنے بھائی کی حاجت پوری کرے، اللہ تعالیٰ اُس کی حاجت برآری کرے گا اور جو آدمی کسی مسلمان کی تکلیف دُور کرے، اللہ تعالےٰ اس کو قیامت کی تکالیف میں سے ہر تکلیف سے بچائے گا۔ اور جو شخص کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا، اللہ تعالےٰ قیامت

کے دن اُس کی پردہ پوشی فرمائے گا۔ ایک حدیثِ مبارکہ میں ہے حضور نبی کریم علیہ التحیۃ والتسلیم نے تین بار خدا کی قسم کے ساتھ فرمایا کہ وہ شخص صاحبِ ایمان نہیں ہے جس کے ہمسائے اس کی بُرائی سے مامون و محفوظ نہ ہوں۔ صحیح بخاری میں ہے، سرکارؐ نے فرمایا کہ طاقت ور وہ نہیں جو کُشتی میں کسی کو پچھاڑ دے۔ طاقتور وہ ہے جو حالتِ غضب میں اپنے نفس پر قابو پالے۔

سُورہ الحجرات میں خداوندِ قدوس و لایزال نے فرمایا: "اور کوئی تم میں سے کسی دوسرے کی غیبت نہ کرے۔ کیا تم میں سے کوئی بھی اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانا پسند کرتا ہے" مسلم شریف میں ہے، حضور سیدِ انام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے صحابہؓ کو فرمایا، جانتے ہو غیبت کیا ہے؟ صحابہ نے عرض کیا۔ اللہ و رسولؐ بہتر جانتے ہیں۔ فرمایا غیبت یہ ہے کہ تو اپنے بھائی کے متعلق ایسی بات کہے جو اسے بُری لگے۔ کسی نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم! اگر میرے بھائی میں وہ بُرائی موجود ہو جس کا ذکر کیا گیا ہے، تو کیا یہ بھی غیبت کہلائے گی؟ فرمایا کہ جو برائی اُس میں موجود ہے، اسی کا ذکر تو غیبت ہے، اگر ایسی بات کہو جو اس میں موجود نہ ہو تو یہ بہتان ہے۔ بخاری و مسلم میں ہے، سرکارؐ نے فرمایا کہ ہر اکھڑ، بدخلق اور متکبر شخص دوزخی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ جس شخص کو امانت دی جائے تو خیانت کرے، باتیں کریں تو جھوٹ بولے، عہد کرے تو خلاف ورزی کرے اور کسی سے جھگڑا ہو تو بدزبانی کرے —— ایسا شخص خالص منافق ہے۔ ترمذی شریف میں ہے۔ آقا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے بہترین شخص وہ ہے جس کی بھلائی کے لوگ متوقع اور اُمیدوار ہوں اور اُس کے شر سے محفوظ و مامون زندگی گزارتے ہوں۔ سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ نے دُنیا سے یہ حقیقت منوالی کہ کوئی ایسی نیکی نہیں ہو سکتی جو سرکارؐ کی سیرتِ طیبہ میں بدرجۂ اتم موجود نہ ہو۔ جو صفت سرکارؐ میں نہیں، وہ اچھائی ہو ہی نہیں سکتی، بُرائی ہوگی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دُنیا کو حُسنِ اخلاق کی تعلیم دی، مسلمانوں کو معاشرتی اقدار سکھائیں، ایک دوسرے کے کام آنے کو کہا، ایک دوسرے کی خامیوں کوتاہیوں سے صرفِ نظر کی تلقین کی۔ فرمایا کہ ہر مسلمان

دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ کوئی مسلمان کسی مسلمان پر نہ ظلم کرے اور نہ اُسے رسوا ہونے دے اور نہ اسے ذلیل و حقیر سمجھے۔ فرمایا انسان کے لیے اتنی بُرائی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر اور ذلیل سمجھے۔ مسلمان کی ساری چیزیں، اس کا خون، اُس کا مال اور آبرو، دوسرے مسلمان پر حرام ہیں (صحیح مسلم)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر نیکی، ہر اچھائی کی تلقین اپنے عمل کے ذریعے فرمائی۔ حضرت علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہٗ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نہایت نرم مزاج اور خوش اخلاق تھے۔ آپ کا چہرہ ہنستا تھا۔ وقار اور متانت سے گفتگو فرماتے تھے۔ کسی کی دل شکنی نہیں فرماتے تھے۔ صحیح بخاری میں ہے۔ آقا حضور صلی اللہ علیہ وسلم مطیع کو بشارت دیتے اور گنہگار کو ڈر سناتے تھے۔ آپ بے خبروں کی پناہ تھے۔ خدا کے بندے اور رسولؐ، محمد کاموں کو اللہ پر چھوڑ دینے والے۔ نہ درشت خُو، نہ سخت گو۔

ایک مرتبہ ایک شخص نے حضور سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی اجازت چاہی۔ وہ شخص اپنے قبیلے میں اچھا آدمی نہیں تھا، اور سرکار صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم بھی تھا۔ آپ نے اسے آنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ وہ حاضر ہوا تو آپ نے نہایت شفقت آمیز لہجے میں اس سے گفتگو فرمائی۔ ام المومنین سیّدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ وہ تو اچھا آدمی نہیں تھا۔ سرکارؐ نے فرمایا، خدا کے نزدیک سب سے بُرا وہ ہے جس کی بدزبانی کی وجہ سے لوگ اس سے ملنا جُلنا ترک کردیں۔

زید بن حارثہؓ مالکِ ہر دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام تھے۔ آپ نے ان کو آزاد کردیا تھا۔ اُن کے والد انہیں لینے آئے تو حضرت زیدؓ نے ان کے ساتھ جانے سے انکار کردیا کہ سرکارؐ کی شفقت، شفقتِ پدری سے بدرجہا زیادہ تھی۔

کفارِ مکہ نے حضور رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو بے حد تکلیفیں پہنچائیں، ایذائیں دیں، پریشان کرنا چاہا، لیکن سرکارؐ نے اُن کی ہدایت کے لیے دُعائیں کیں۔ جب وہ لوگ مغلوب ہوگئے، اللہ نے مسلمانوں کو ان پر فتح یاب کیا، فتحِ مکہ کے اس موقع پر سرکارؐ نے انہیں "لا تثریب" کی نوید سُنائی، ان کے عفوِ عام کا اعلان فرمادیا۔

حضور محبوب کبریا علیہ الصلوٰۃ والثنا نے اللہ کے حکم سے مدینۂ پاک کی طرف ہجرت فرمائی تو قریشِ مکہ نے سرکارؐ کے سرِ مبارک کی قیمت سو اُونٹ مقرر کی۔ اس لالچ میں سراقہ نے پیچھا کیا۔ سرکارؐ نے دیکھا تو سراقہ زمین میں دھنسنے لگا۔ اس نے امان چاہی تو زمین سے نکل آیا۔ پھر نیت بدلی تو پھر زمین میں دھنسنے لگا۔ پھر بکرم سے چھٹکارا مانگا تو سرکارؐ نے پھر معاف فرما دیا۔ وہ کھسیانا ہو کر واپس لوٹ گیا۔ فتح مکہ کے بعد وہ اسلام میں داخل ہوا تو آقا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے کبھی ہجرت والے واقعے کا ذکر تک نہ فرمایا۔

اگر حضور نورِ مجسم صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی کی بات بُری لگتی تو آپ مجلس میں اس کا نام لے کر اس بُری بات کا ذکر نہ فرماتے بلکہ فرماتے کہ بعض لوگ ایسا کرتے یا کہتے ہیں، اس میں فلاں فلاں خرابی ہے۔ مقصد یہ ہوتا کہ اس آدمی کی تحقیر اور ذلت نہ ہو۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں، میں نے سات سال تک آقا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کی سرکارؐ نے نہ کبھی یہ فرمایا کہ فلاں کام تم نے کیوں نہیں کیا، نہ یہ فرمایا کہ فلاں کام کیوں کیا ہے۔

بنو نجران کے عیسائیوں کا وفد رحمتِ عالمیان صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہُوا تو آپ نے ان کو مسجد نبوی میں ٹھہرایا اور خود ان مہمانوں کی خبر گیری فرماتے رہے۔ ایک دن انہوں نے عرض کی کہ آج ہماری عبادت کا دن ہے، ہم کیا کریں۔ حضورؐ نے انہیں مسجد نبوی میں اپنے طریقے سے عبادت کرنے کی اجازت مرحمت فرمادی۔

ایک مرتبہ ایک بدو نے عین حالتِ نماز میں حضور فخرِ موجودات علیہ السلام والصلوٰۃ کا دامن پکڑ لیا کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیک وسلم) میری فلاں حاجت پوری نہیں ہوئی اسے پورا فرما دیں، مبادا میں بعد میں بھول جاؤں۔ سرکارؐ اسی وقت اس کے ساتھ تشریف لے گئے اور اس کا کام کر دیا۔

ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور ان کے صاحبزادہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ، حضور حبیب کبریا علیہ التحیۃ والثنا کے ہم سفر تھے۔ حضرت عبداللہ کا اُونٹ بہت سرکش تھا، وہ آقا و مولاؐ کی سواری سے آگے نکل جاتا تھا۔ حضرت فاروقِ اعظمؓ نے صاحبزادے کو ڈانٹا کہ اُونٹ کو روکتے کیوں نہیں۔ سرکار (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا

عمرؓ یہ اونٹ مجھے بیچ دو۔ انہوں نے نذر کرنا چاہا، مگر سرکارؐ نے قیمت دے کر لیا اور حضرت عبداللہؓ کو عطا فرما دیا کہ اب یہ تمہارا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم بعض امور انجام دینے کے لیے خود تکلیف گوارا فرما لیتے مگر کسی کو حکم نہیں فرماتے تھے۔ جب کوئی شخص سامنے آ کر جرم کی معافی مانگ لیتا تو سرکارؐ اپنی گردن مبارک جھکا لیتے تھے۔ کعب ابن زُہیر نے سرکارؐ کی ہجو کہی۔ آپ نے ہمیں تعلیم دینے کے لیے، اُس کے لیے حکم فرما دیا کہ کعب جہاں ملے، اسے قتل کر دو، اگرچہ وہ دیوارِ کعبہ ہی سے کیوں نہ لپٹا ہُوا ہو۔ مقصد یہ تھا کہ امت کو معلوم ہو جائے کہ نبی الانبیا علیہ الصلوٰۃ والثنا کی توہین و تضحیک کتنا بڑا جرم ہے۔ سب جانتے ہیں کہ حرم کی زمین پر خون بہانا جائز نہیں حتیٰ کہ جُوں تک مارنے کی اجازت نہیں اور یہ حرم کی زمین کی بات نہیں، کعبۃ اللہ کی بات ہے۔ پھر کعبۃ اللہ کی چار دیواری کی بات نہیں، خود کعبے کی دیوار اور اس کے ساتھ لپٹے ہونے کی صورت میں بھی کعب کو قتل کر دینے کا حکم صادر فرما رہے ہیں۔ حضور رحمۃ للعالمین (صلی اللہ علیہ وسلم) یہی بتانا مقصود تھا کہ اللہ کے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کس نوعیت کا جُرم ہے —— بہرحال کعب ابنِ زُہیر بھاگ گئے۔ پھر اسلام کی شمع دل میں جلا کر حاضر ہوئے تو سرکارؐ نے نہ صرف انہیں معاف فرما دیا، بلکہ ان کے ایک شعر کی اصلاح فرمائی، انہیں اپنی چادرِ مبارک عنایت فرمائی اور انہیں انعامات سے نوازا۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیا باکرہ لڑکی سے بھی بڑھ کر تھی۔ کوئی مکروہ بات تذکرۃً بھی کوئی کر دیتا تو خاطرِ اقدس پر ملال آ جاتا اور چہرۂ مبارک سے فوراً معلوم ہو جاتا کہ سرکارؐ کو بات پسند نہیں آئی۔

حضور رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو جو شخص ملتا، سرکارؐ پہلے اسے سلام کہتے، مصافحے کے لیے خود پہلے ہاتھ بڑھاتے، کسی کی بات کو درمیان میں نہیں کاٹتے تھے۔ آپ اس قدر کریم تھے کہ آپ نے اپنی حیاتِ مبارکہ میں کسی سائل کے جواب میں کبھی "نہ" نہیں فرمائی۔

نہ یہاں "نہ" ہے، نہ منگتا سے یہ کہنا، کیا ہے؟

آپ نے کبھی کسی سائل کے سوال کو رد نہیں فرمایا۔ اگر پاس کچھ بھی نہ ہوتا تو کسی سے قرض لے کر عطا فرما دیتے۔

سرکارؐ کا معمول تھا کہ کبھی کھانا تنہا تناول نہیں فرماتے تھے۔ اگر کوئی چیز پسند نہ ہوتی تو اس کی طرف دستِ مبارک نہیں بڑھاتے تھے، لیکن اسے بُرا نہیں کہتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جو چیز آتی، اسے فوراً خرچ فرما دیتے یا تقسیم فرما دیتے۔ اگر کسی وجہ سے بچ رہتی تو جب تک وہ صرف نہ ہو جاتی، سرکارؐ کی طرف سے بے چینی کا اظہار ہوتا تھا۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ راوی ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اگر احد کا پہاڑ میرے لیے سونا ہو جائے تو میں کبھی یہ پسند نہ کروں گا کہ تین راتیں گزر جائیں اور میرے پاس ایک دینار بھی رہ جائے۔ ہاں صرف وہ رقم، جو میں قرض ادا کرنے کے لیے رکھ چھوڑوں۔

آقا حضورؐ نے سوال کرنے سے منع فرمایا ہے۔ ارشادِ گرامی ہے کہ "کمر پہ لکڑی کا گٹھا لاد کر اپنی آبرو بچانا سوال کرنے کی ذلت سے بہتر ہے"۔

سرکارؐ کو سادگی بہت پسند تھی۔ ہر چیز میں سادگی پسند خاطر تھی۔ جو چیز سامنے آتی، تناول فرما لیتے۔ زمین، فرش یا چٹائی پر آرام فرما لیتے تھے۔ لباس میں بھی کبھی نمائش کو پسند نہ فرمایا۔

حضورؐ سادہ تھے، تم بھی دعا کرو محمودؔ
کہ سادگی کی محبت خدا نصیب کرے

سرکار (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے کام خود کر لیتے تھے۔ سودا خود خرید فرماتے، جوتا پھٹ جاتا تو خود گانٹھ لیتے، گھر میں جھاڑو دے لیتے، لوگوں کی بیمار پرسی کے لیے جاتے، ان کی دلجوئی فرماتے۔ غریبوں، مسکینوں کی زیادہ خاطرداری فرماتے۔ سرکارؐ دعا فرمایا کرتے تھے کہ خداوندا، مجھے غریب رکھ، غریب اٹھا اور غریبوں کے

ساتھ میرا حشر ہو۔ ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو سرکارؐ نے فرمایا، "اے عائشہ! کسی مسکین کو اپنے ہاں سے کبھی نامراد نہ لوٹانا۔ کچھ نہ ہو، تو چھوہارے کا ایک ٹکڑا ہی دے دینا۔ اگر تم غریبوں سے محبت کرو گی تو خدا تم سے محبت کرے گا۔"

قریشِ مکہ نے سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بدتمیزیاں کیں، فحش کلامی کی، اذیتیں دیں، جسمِ مبارک پر نجاستیں پھینکیں، غرض طرح طرح کی گستاخیاں کیں اور تکلیفیں پہنچائیں مگر سرکارؐ نے ایک بار بھی ان پر غصے کا اظہار نہیں فرمایا۔ یہی دعا فرماتے رہے کہ خدایا، یہ بے شعور ہیں، انہیں سمجھ عطا کر اور ہدایت کا راستہ دکھا۔ ایک بار ایک شخص نے جسے سرکارؐ سے کچھ قرضہ لینا تھا، گستاخانہ گفتگو شروع کی۔ صحابہ کرامؓ نے اسے ڈانٹا تو سرکارؐ نے فرمایا کہ مجھے اس کا قرض دینا ہے، اس کے ساتھ کوئی سخت بات مجھے یا تمہیں روا نہیں۔ پھر آپ نے صحابہؓ کو اس کا قرض ادا کرنے کا حکم دیا اور کچھ زیادہ دلوایا۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے رتبے سے واقف تھے، اور آپ پر اپنی جانیں نچھاور کرتے تھے۔ آپ وضو فرماتے تو وہ سرکارؐ کے وضو کا پانی نیچے زمین پر نہیں گرنے دیتے تھے، اپنے ہاتھوں میں لے کر منہ پر اور جسم پر مل لیتے تھے۔ سرکارؐ کے بال مبارک سے لوگ فیض حاصل کرتے تھے۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے حضورؐ کے موئے مبارک کو اپنی ٹوپی میں سلوا لیا تھا اور اسی کی برکت سے کفار پر ہر لڑائی میں فتح یاب ہوتے تھے۔ خود خداوندِ قدوس و کریم جلّ وعلا نے مسلمانوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت و توقیر کرنے کی ہدایت فرمائی ہے۔ پھر حضورؐ کی آواز سے کسی کو اپنی آواز اونچی کرنے کی اجازت نہیں ہے، سرکارؐ کے سامنے کوئی آدمی چلا کر بات نہیں کر سکتا اور اس انداز میں سرکارؐ سے بات کرنے کی اجازت کسی کو نہیں جس طرح آپس میں بات کی جاتی ہے۔ اگر سرکارؐ حجرے میں تشریف فرما ہوں تو اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام کو ہدایت کی کہ وہ باہر انتظار کریں، کوئی آدمی انہیں آواز دینے کی جسارت نہ کرے جب وہ خود باہر تشریف لائیں تو جو گزارش کسی کو کرنا ہو، کر سکتا ہے۔

اس سے واضح ہے کہ سرکارؐ جیسا کوئی دوسرا نہیں، اور سرکارؐ کسی حد سے [illegible]

نہیں، مسلمان وہ ہے جو دل سے سرکارؐ کی عزت کرے۔ ایسا نہیں تو اس کا دعویٰ اسلام باطل ہے۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو مساوات کی تعلیم دینے کے لیے اپنے ساتھیوں کو، اپنے اُمتیوں کو عزت و تکریم سے نوازا۔ ایک بار حضرت سعد بن عبادہؓ کے صاحبزادے قیس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمراہی میں تھے۔ حضورؐ نے فرمایا، قیس! تم بھی میرے اونٹ پر سوار ہو جاؤ۔ انہوں نے اسے بے ادبی سمجھا اور تامل کیا۔ سرکارؐ نے ارشاد فرمایا کہ یا میرے ساتھ سوار ہو جاؤ یا گھر واپس چلے جاؤ۔ قیس حضورؐ کے حکم سے واپس چلے گئے۔ لیکن ساتھ سوار نہیں ہوئے۔ ایسے ہی ایک اور موقع پر حضورؐ نے عقبہ بن عامرؓ کو اونٹ پر سوار ہونے کو کہا، وہ حضور کی ہمراہی میں پیدل چل رہے تھے۔ انہوں نے اسے بے ادبی پر محمول کیا اور معذرت کی۔ سرکارؐ نے دوبارہ حکم دیا تو نافرمانی سے بچنے کیلئے وہ اونٹ پر سوار ہو گئے اور سرکارؐ پیدل چل پڑے۔ مسجد نبوی کی تعمیر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی دوسروں کی طرح برابر اینٹ اور گارا اُٹھاتے رہے۔ صحابہؓ نے بہت کچھ گزارشیں کیں کہ ہمارے ماں باپ آپ پر قربان آپ زحمت نہ فرمایئے لیکن سرکارؐ برابر مصروفِ کار رہے۔ اسی طرح غزوۂ احزاب میں خندق کھودنے کے عمل میں سرکارؐ دوسروں کے دوش بدوش کام میں مصروف تھے، اسی موقع پر صحابہؓ پر انکشاف ہُوا کہ سرکارؐ کے پیٹ پر دو پتھر بندھے ہیں۔

پیٹ پر بھوک سے پتھر تھا بندھا سب کے مگر
دو شہِ دیںؐ کے شکم پر نظر آئے پتھر

حضور رسولِ انام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ہمیں استغنا کا سبق دیا، استقامت کی تلقین فرمائی، استقلال کو اختیار کرنے کا حکم دیا، شجاعت کی تعلیم دی۔ جب کفارِ مکہ نے دیکھا کہ طرح طرح کی تکلیفیں پہنچانے سے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پائے استقلال و استقامت میں لغزش نہیں آئی اور حضورؐ مرعوب نہیں ہوئے تو انہوں نے قسم قسم کے لالچ دینا چاہے۔ حضور سرکارِ دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم نے سب لالچوں کو پائے استحقار سے ٹھکرا دیا اور فرمایا کہ اگر تم لوگ میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ

پر چاند بھی لا کر رکھ دو، تو بھی میں حق کی تبلیغ سے باز نہیں آؤں گا۔ کائناتِ عالم کی تمام مخلوقات پر یہ واضح کر کے رہوں گا کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اس کا بھیجا ہوا ہوں۔

سرکارؐ اشجع الناس تھے۔ حضرت علی شیرِ خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جب بدر میں گھمسان کی جنگ شروع ہوئی تو ہم لوگوں نے آقا حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی پناہ لی تھی۔ اس دن مشرکین و کفار کی صفوں کے سب سے زیادہ قریب سرکارؐ کے سوا کوئی نہ تھا۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں، ایک مرتبہ مدینہ طیبہ میں شور ہوا کہ دشمن آگیا۔ آقائے کائنات علیہ السلام والصلوٰۃ فوراً بغیر زین کے ایک گھوڑے پر سوار ہو کر تنِ تنہا تشریف لے گئے اور گشت کے بعد واپس آکر سب کو تسلی دی کہ خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔ شجاعت کی اس انتہا کے ساتھ رحمۃ للعالمینی کی یہ انتہا ہے کہ سرکارؐ نے کبھی کسی شخص کو اپنے ہاتھ سے قتل نہیں کیا۔

پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ سرکارِ دو جہاں سرخیلِ مرسلاں صلی اللہ علیہ وسلم وضو فرماتے اور سرکارؐ کے نام لیوا صحابی وضو کے پانی کو زمین پر گرنے نہ دیتے، چلوؤں میں لے کر جسم پر مل لیتے تھے۔ ایک مرتبہ سرکار صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ایسا کیوں کرتے ہو؟ صحابہؓ نے عرض کیا، سرکار! خدا اور اس کے رسولؐ کی محبت میں ایسا کرتے ہیں۔ سرکارؐ نے منع نہیں فرمایا۔ فرمایا، خدا اور خدا کے رسولؐ کی رضا کے لیے ایسا بھی کیا کرو کہ جب بات کرو تو سچ بولو، جب امین بنائے جاؤ تو امانت کا حق ادا کرو اور اپنے پڑوسی کے حق کو ادا کیا کرو۔ یعنی سرکارؐ نے جہاں اپنی عزت و توقیر اور محبت و عقیدت میں کیے جانے والے اس کام پر مُہرِ توثیق ثبت فرما دی، وہاں حسنِ معاشرت کی تلقین فرمائی، حسنِ خلق کی ہدایت فرمائی۔

نبوت سے پہلے کا واقعہ ہے کہ ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ معاملہ کیا اور سرکارؐ کو ایک جگہ بٹھا کر خود کہیں چلا گیا کہ میں ابھی آتا ہوں۔ وہ شخص تیسرے دن واپس آیا تو سرکارؐ وہیں بیٹھے اس کا انتظار فرما رہے تھے۔ سرکارؐ نے اسے صرف یہ فرمایا

کہ میں تین دن سے تمہارے انتظار میں یہیں بیٹھا ہوں۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام بڑے مہمان نواز تھے اور مہمانوں کی خدمت اور خاطر فرماتے تھے۔ ایک بار حبش کے بادشاہ نجاشی کے کچھ سفیر آئے۔ سرکارؐ نے انہیں اپنے ہاں مہمان رکھا اور خود بنفسِ نفیس میزبان کا کام انجام دیا۔ صحابہؓ نے بہت عرض کی کہ ہمیں یہ خدمت انجام دینے کی اجازت فرمائیں۔ سرکارؐ نے ارشاد فرمایا کہ اُن لوگوں نے میرے دوستوں کی خدمت گزاری کی ہے، اس لیے میں خود ان کی میزبانی کے فرائض انجام دُوں گا۔ بُخاری شریف میں ابو شریح کعبی سے روایت ہے۔ سرورِ کون ومکاں صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ اور قیامت پر ایمان رکھتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ مہمان کی خاطر کرے۔ ایک دن رات کی مہمانی لازمی ہے اور تین دن کی ضیافت افضل ہے۔ اس کے بعد صدقے میں شمار ہوتی ہے اور مہمان کے لیے مُناسب نہیں کہ میزبان کے پاس پڑا رہے اور اسے تنگ کر ڈالے۔

جب کوئی آدمی بیمار ہوتا تو سرکار (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کی تیمارداری کے لیے تشریف لے جاتے۔ بیمار کے نزدیک بیٹھ جاتے، اس کو تسلی دیتے، اس سے دریافت فرماتے کہ کس چیز کو جی چاہتا ہے۔ اگر وہ چیز مریض کے لیے نقصان دہ نہ ہوتی تو مہیا کرنے کا اہتمام فرما دیتے۔ تیمارداری کے علاوہ دوا کی بھی تاکید فرماتے۔

غرض اخلاقِ حسنہ اپنی انتہا میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ میں موجود تھے۔ حضورؐ عدل فرماتے، احسان فرماتے، رافت اور رحم فرماتے کہ خداوندِ کریم نے انہیں مومنوں کے لیے رؤف ورحیم فرمایا ہے۔ کسی کے دُکھ پر آپ آبدیدہ ہو جاتے، ہر آدمی کے دُکھ میں شریک ہوتے۔ آپؐ کو غربا اور مساکین سے محبت تھی، آپ غلاموں اور قیدیوں سے حسنِ سلوک فرماتے۔ حیوانات پر رحم کی بہت سی مثالیں سرکارؐ کی سیرتِ پاک میں نظر آتی ہیں۔ آپ کو بچوں سے بہت محبت تھی، ان پر شفقت فرماتے تھے۔ اور حضور سرورِ ہر دو جہاں، رحمتِ عالمیاں صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر بھلائی ہر نیکی، ہر اچھائی کی مسلمانوں کو تلقین فرمائی لیکن یہ تلقین اپنے حسنِ کردار کے

حوالے سے فرمائی۔ اسی لیے خداوندِ تبارک وتعالیٰ نے سرکارؐ کی حیاتِ طیبہ کو مسلمانوں کے لیے بہترین نمونہ فرمایا۔ اللہ کریم ہمیں صاحبِ خلقِ عظیم آقا (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ارشادات کی تکمیل اور آپ کی پاک زندگی کی تقلید میں حُسنِ اخلاق کی نعمت سے بہرہ یاب کرے۔ آمین!

دعا

میری یہ تجھ سے عرض ہے اے ربِ کردگار!
توفیق دے مجھے کہ میں تا عرصۂ شمار
مدحِ رسولِ پاک ہی رکھوں اختیار
میرا یہی طریق ہو، میرا یہی شعار
محشر میں جب فرشتے عمل تولنے لگیں
نعتیں مرے حساب میں خود بولنے لگیں

ختمی مرتبت سرکار صلی اللہ علیہ وسلم

ہر نبی مخلوقِ خدا کے لیے خدا تعالیٰ کی طرف سے ہدایت، شریعت یا کتاب لاتا ہے۔ بنی نوعِ انسان کی نجات کے لیے اللہ کریم جل وعلا کے پروگرام سے نبی براہِ راست واقف اور مطلع ہوتا ہے اور اس پروگرام کو وحیِ الٰہی کی رہنمائی میں وہ لوگوں تک پہنچاتا ہے اور خود اس پروگرام پر عمل کر کے عامۃ الناس کو دکھاتا بھی ہے تاکہ انہیں بھی نیکی کے اس راستے پر چلنے کی ترغیب ہو۔

اصل چیز انسانیت کی ہدایت ہے جسے نازل کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انبیاء و رسل کو بھیجنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ ایک نبی بھیجا جاتا۔ وہ بعض اُمور کے لیے ہدایت جاری کرتا اور کچھ پہلو رہ جاتے۔ پھر دوسرا نبی آتا اور بعض احکام جاری کرتا، لیکن پھر کچھ امور رہ جاتے۔ سارے عالمِ انسانیت کے لیے ہر لحاظ سے مکمل ہدایت پہلے کبھی نازل نہ کی گئی تھی۔ نہ پہلے انبیاء کی عملی رہنمائی زندگی کے تمام شعبوں کو محیط تھی۔ مثلاً حضرت سلیمان علیہ السلام نے شاہی میں زندگی گزاری تھی اور فقر و استغنا کے لیے ان کی حیاتِ مبارکہ میں کوئی نمونہ نہیں ہے۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تجرد کی زندگی گزاری۔ ان کی پاک زندگی میں ازدواجی رہنمائی نہیں ملتی۔ چنانچہ پہلی ساری شریعتیں جزوی تھیں۔ پہلے تمام انبیاء کی زندگیاں ہر لحاظ سے پوری انسانیت کے لیے مکمل نمونہ بھی نہ تھیں۔ پہلے کسی نبی کے ہاں پورے کا پورا ضابطۂ اخلاق بھی نہیں ملتا۔

جب تک کوئی چیز اپنے کمال کو نہیں پہنچتی، اس میں ارتقائی تغیرات آتے رہتے ہیں اور جب وہ مرتبۂ کمال کو پہنچ جاتی ہے، اس میں ارتقا کا کوئی سوال نہیں ہوتا۔ اس میں تغیر نہیں آتا۔ وہ آخر تک اسی مرتبۂ کمال پر رہتی ہے۔ اس میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا، اسے آگے بڑھانے کی حاجت نہیں ہوتی۔ شریعت اور احکامِ ربانی کا سلسلہ حضرت آدم

سے شروع ہُوا اور ارتقائی منازل طے کرتا ہُوا حضور فخرِ موجودات باعثِ ظہورِ کائنات علیہ السلام والصلوٰۃ تک پہنچا تو اپنے منتہائے کمال تک پہنچ گیا۔ اسی لیے خدا تعالےٰ نے فرمایا۔ الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی (سورہ المائدہ) یعنی آج میں نے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت کو مکمل کر دیا۔ سُورہ الاحزاب میں ہے لقد کان لکم فی رسول اللّٰہ اسوۃ حسنۃ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ تمہارے لیے بہترین نمونہ ہے اور حضور نبی کریم علیہ التحیۃ والتسلیم نے ارشاد فرمایا بعثت لا تمم مکارم الاخلاق۔ میں اس لیے آیا ہوں کہ نظامِ اخلاق کو مکمل کر دُوں۔

اللہ نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم پر دین مکمل کر دیا، حضورؐ کی زندگی کو نمونۂ کامل قرار دیا، حضورؐ نے ادھورے اخلاق کو پُورا فرمانے کے لیے اپنی تشریف آوری کا اعلان فرمایا تو پھر سرکارؐ کے بعد کسی نبی کے آنے کی کیا حاجت رہ جاتی ہے جب دین نے اپنے مرتبۂ کمال کو جا لیا، جب نبی الانبیا علیہ التحیۃ والثنا کی حیاتِ مطہرہ ہر بندے کے لیے کامل نمونہ قرار دے دی گئی۔ یعنی اُس میں زندگی کے ہر پہلو کے لیے رہنمائی موجود ہونے کا اعلان فرما دیا گیا اور حضورؐ نے نظامِ اخلاق کی تکمیل بھی فرما دی اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو سب جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجنے کی بات بھی واضح ہو گئی۔ وما ارسلنٰک الا رحمۃ للعٰلمین تو پھر ان کے بعد کسی نبی کی کیا ضرورت باقی رہی۔

اللہ تعالیٰ کا نظامِ رحمت ہے جو ہمیں بچائے ہوئے ہے۔ سُورج کی حدّت کے اور ہمارے درمیان نظامِ رحمت حائل ہے کہ ہم جل بُھن نہیں جاتے۔ طُوفانوں کے راستے میں یہی نظامِ رحمت رکاوٹ ہے کہ ہم محفوظ ہیں۔ یہی نظامِ رحمت کائنات کو ایک خاص پروگرام کے تحت چلا رہا ہے۔ اسی نظامِ رحمت کی برکت ہے کہ پُورا نظامِ شمسی دھڑام سے گر نہیں پڑتا، ایک سیّارہ دوسرے سیّاروں سے نہیں ٹکرا جاتا۔ چاند خود سے روشن نہیں ہے لیکن اسی نظامِ رحمت کی بدولت سُورج سے روشنی لے کر اس کے انعکاس کو چاندنی کے رُوپ میں ہم پر نچھاور کرتا ہے اور ہم اس

سے مستفید ہوتے ہیں۔ یہی نظامِ رحمت ہمارے اندر موجود خلیوں کو پیدا کرتا ہے، ختم کرتا ہے، انہیں ترتیب اور تنظیم بخشتا ہے۔ یہ نظامِ رحمت نہ ہوتا تو ایک خلیہ کروڑوں خلیوں کو جنم نہ دے سکتا اور ایک خلیے سے جسمِ انسانی کے ہر حصے کے خلیے الگ الگ ایک نظام کے تحت جنم لیتے، ختم ہوتے اور انسانی جسم کو چلاتے نہ رہتے —— یہی نظامِ رحمت قرآن کی زبان میں "رحمۃ للعالمین" کہلاتا ہے —— پہلے انبیا تو اپنے اپنے علاقے، اپنے اپنے قبیلے کے لیے رہنمائی کی ذمہ داری سنبھالتے رہے۔ اب حضورؐ تمام دنیاؤں کے لیے رحمت بن کر آئے، کوئی سیارہ، کوئی مقام، کوئی مخلوق ان کے دائرۂ رحمت سے باہر نہیں۔ انہوں نے نظامِ اخلاق کی بھی تکمیل فرما دی، ان پر دین بھی مکمل ہو گیا، ان کی سیرتِ مطہرہ نمونۂ کامل بھی قرار دی گئی۔ پھر اُن کے بعد کیا اضافہ ممکن ہے، کیا ترقی رہ گئی، کس تکمیل کی حاجت ہے۔ چنانچہ نبوت کا سلسلہ بھی ہمیشہ کے لیے بند کر دیا گیا۔

سورۂ الاحزاب میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔ ما کان محمد ابا احد من رجالکم و لکن رسول اللّٰہ و خاتم النبیین وکان اللّٰہ بکل شیء علیما۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم، تم میں سے کسی مرد کے باپ نہیں ہیں۔ لیکن آپ اللہ کے رسُول اور تمام نبیوں میں آخری ہیں اور اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔ سنن ابوداؤد اور ترمذی شریف میں ایک حدیث پاک ہے۔ سرکارِ دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتی جب تک بہت سے دجال اور کذّاب نہ اُٹھائے جائیں جن میں سے ہر ایک یہ کہتا ہو کہ وہ نبی ہے۔ حالانکہ میں خاتم النبیین ہوں اور میرے بعد کوئی نبی نہیں"۔ بُخاری شریف اور ترمذی شریف کی ایک حدیث پاک حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ جب لوگ قیامت کے دن تمام انبیا کے پاس سے ٹھوکریں کھانے پریشان حال حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں گے تو یہ کہیں گے کہ انت رسول اللّٰہ و خاتم الانبیاء (آپ اللہ کے رسولؐ ہیں اور خاتم الانبیا ہیں) صحیح مُسلم میں حضرت ابوہریرہؓ ہی سے مروی ایک

حدیث مبارکہ میں ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے دیگر انبیاء کرام پر اپنی چھ فضیلتوں کا ذکر فرمایا جن میں سے ایک یہ ہے کہ "مجھ سے انبیاء کو ختم کیا گیا۔" دارمی میں حضرت جابرؓ سے مروی ایک حدیث میں ہے۔ حضور سیدِ انام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا "میں قائدِ مرسلین ہوں اور فخر نہیں، میں خاتم النبیین ہوں اور فخر نہیں۔" صحیحین میں ہے۔ "میری مثال اور مجھ سے پہلے انبیاء کی مثال ایسی ہے جیسے کسی شخص نے گھر بنایا ہو، اسے آراستہ پیراستہ کیا ہو مگر ایک اینٹ کی جگہ چھوڑ دی ہو۔ لوگ اگر اس گھر کا پھیرا لگاتے ہوں، ان کو یہ عمارت بہت پسند آتی ہو مگر کہتے ہوں کہ یہ ایک اینٹ بھی کیوں نہ رکھ دی گئی (کہ عمارت مکمل ہو جاتی۔) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میں وہی اینٹ ہوں اور میں خاتم النبیین ہوں۔"

بخاری شریف اور مسلم شریف میں حضرت ابوہریرہؓ سے اور ترمذی شریف میں حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ اور حضرت جابرؓ سے کئی حدیثیں مروی ہیں جن میں سرکار (صلے اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا کہ "میرے بعد کوئی نبی نہیں۔" ابن ماجہ میں ہے۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میں سب نبیوں سے آخر میں آنے والا ہوں اور تم سب امتوں کے آخر میں آنے والے ہو۔"

غرض قرآن و حدیث میں حضور سیدِ عالم صلے اللہ علیہ وسلم کے آخری نبی ہونے کے واضح اعلانات ملتے ہیں۔ لیکن جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، دجال اور کذاب لوگوں کی خبر بھی حضورؐ نے سنادی کہ وہ بعد میں بھی نبوت کا دعوی کریں گے جو جھوٹا ہوگا۔

آقا حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد بہت سے جھوٹوں نے "نبی" ہونے کا ادعا کیا جن میں مسیلمہ کذاب بہت مشہور ہے کہ حضورؐ کی حیاتِ مبارکہ ہی میں اس نے یہ حرکت کرنے کی جسارت کرلی تھی۔

آقا حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ کو اس فتنے کے سدِ باب کا اعزاز حاصل ہوا۔ اسود عنسی قبیلہ بنو اسلم سے تھا۔ اس نے ۱۵ صفر ۱۱ ہجری

کو نبوت کا دعوی کیا۔ سجاح قبیلہ بنو تغلب کے سردار کی لڑکی تھی اور شہر موصل کی رہنے والی تھی۔ اس نے ۲۸ ربیع الثانی ۱۱ ہجری کو نبوت کا دعوی کیا۔ حکم بن ہشام (المقنع) نے ۱۱ اپریل ۷۵۹ء کو یہ جھوٹ بولا۔ قرمط ۸۵۹ء کو کوفہ میں پیدا ہوا۔ اسے ۲۳ اپریل ۸۹۱ء کو اس جھوٹ کی جسارت ہوئی۔ مرزا علی محمد باب ۱۸۱۹ء میں شیراز میں پیدا ہوا، اس نے بھی نبوت کا دعوی کیا۔ بہاء اللہ ایرانی اور غلام احمد قادیانی نے بھی یہی حرکت کی۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کے متعلق کہا۔

آں ز ایراں بود و ایں ہندی نژاد
آں ز حج بیگانہ و ایں از جہاد
سینہ ہا از گرمیٔ قرآں تہی!
از چنیں مرداں چہ امیدِ بہی

(وہ ایران سے تھا اور یہ ہندی نسل سے ہے۔ وہ حج سے بیگانہ تھا یہ جہاد سے بیگانہ ہے۔ ان کے سینے قرآن کی گرمی سے خالی تھے ایسوں سے بھلائی کی کیا امید ہو سکتی ہے)

مرزا غلام احمد قادیانی چونکہ ہندی النسل ہیں، اس لیے برصغیر میں ان کے ماننے والے موجود ہیں۔ مرزا غلام احمد، برلاس قوم سے ہونے کے مدعی تھے۔ ان کے سوانح نگار عبدالقادر (سابق سوداگرمل) کے بقول، کوئی مستند دستاویز ایسی نہیں جن کی بنا پر صحیح تاریخ ولادت بتائی جا سکے۔ البتہ مرزا بشیر احمد نے بعض تحریروں سے اندازہ لگایا کہ غلام احمد ۱۳ فروری ۱۸۳۵ مطابق ۱۴ شوال ۱۲۵۰ھ کو پیدا ہوئے (حیاتِ طیبہ از عبدالقادر ص ۱۲) مسلمان پہلے ہی دن سے قادیانیوں کو کافر سمجھتے تھے، مگر برطانوی حکومت اور اس کے زیر اثر لوگ ان کی حمایت پر کمربستہ رہے۔ آخر مسلمانوں کی بھرپور جدوجہد سے مجبور ہو کر پاکستان قومی اسمبلی نے ۱۹۷۴ء میں قادیانی اور لاہوری جماعت کے افراد کو غیر مسلم اور کافر اقلیت قرار دیا اور ۱۹۸۴ء میں اس اعلان پر عمل درآمد کے لیے حکومت کے سربراہ نے متعلقہ آرڈیننس

جاری کر دیا۔

قرآن و احادیث میں واضح طور پر حضور ختمی مرتبت صلے اللہ علیہ وسلم کو "خاتم النبیین" کہا گیا ہے جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ بعثتِ انبیاء کا سلسلہ سرکارؐ پر ختم ہو چکا لیکن مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنی جعلی نبوت کے اثبات میں قرآنی نص میں تحریفِ معنوی کی اور "خاتم النبیین" کی نئی تعبیر کی۔ لکھا "وہ خاتم الانبیاء ہے، مگر ان معنوں سے نہیں کہ آئندہ اس سے کوئی رُوحانی فیض نہیں ملے گا، بلکہ ان معنوں سے کہ وہ صاحب خاتم ہے۔ بجز اس کی مُہر کے کوئی فیض کسی کو نہیں پہنچ سکتا اور اس کی اُمت کے لیے قیامت تک مکالمہ اور مخاطبہ الٰہیہ کا دروازہ کبھی بند نہ ہوگا۔" (حقیقۃ الوحی۔ از مرزا غلام احمد قادیانی ص ۲۷)

مرزا صاحب کے ملفوظات میں بھی ہے۔ "خاتم النبیین کے معنی یہ ہیں کہ آپ کی مُہر کے بغیر کسی نبوت کی تصدیق نہیں ہو سکتی۔ جب مُہر لگ جاتی ہے تو وہ کاغذ سند ہو جاتا ہے اور مصدقہ سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح آنحضرتؐ کی مُہر اور تصدیق جس نبوت پر نہ ہو وہ صحیح نہیں ہے۔" (ملفوظات۔ مرزا غلام احمد قادیانی۔ جلد پنجم ص ۲۹۰)

قادیانیوں پر اہلِ اسلام کی طرف سے جو اعتراض کیے جاتے ہیں، انہوں نے خاتم النبیین کے معنی کے متعلق ان میں سے ایک اعتراض کا جواب یوں دیا: "خاتم النبیین کے معنی ہیں: نبیوں کی مہر۔ جس طرح مُہر کاغذ پر اپنے نقوش ثبت کرتی ہے اسی طرح آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے نقوشِ قدم پر چلنے سے حسبِ استعداد انسان میں آپ کے فیضانِ نبوت کے نقوش ثبت ہو جاتے ہیں، گویا دوسرے انبیاء کی نسبت اللہ تعالےٰ نے آپ کو خاتم النبیین کا منصب دے کر یہ خاصیت بخشی ہے کہ آپ کی رُوحانی توجہ نبی تراش ہے اور آپ کا کامل متبع نبوت کے مقام پر بھی فائز ہو سکتا ہے۔" (جماعتِ احمدیہ سے متعلق بعض سوالات کے جوابات۔ مرتبہ محمد اسد اللہ قریشی۔ ص ۹)

سیدھی سی بات ہے کہ جس چیز کو بند کرنے کے بعد اس پر مُہر یا سیل لگا دیتے ہیں اس کو عربی میں "ختم" کہا جاتا ہے۔ جیسے سُورہ بقرہ میں ہے ختم اللہ علیٰ قلوبھم کفار کے دلوں پر اللہ تعالےٰ نے مُہر لگا دی ہے۔ یعنی اب ان کے دلوں میں ہدایت

نہیں آ سکتی۔ اسی طرح حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے کا واضح مطلب اس کے علاوہ ہو ہی نہیں سکتا کہ اب کوئی اور نبی نہیں آئے گا اور جب احادیثِ نبوی میں واضح طور پر یہی معنی موجود ہیں تو یہ بات قابلِ بحث ہی نہیں رہتی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ نبی بننے کے شوق میں مرزا غلام احمد قادیانی اتنی سی بات کو بھی لوگوں کی نظروں سے چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ نبی بنانا اللہ کا کام ہے، حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا نہیں۔ سُورہ الانعام میں ارشادِ خداوندی ہے۔ اللہ اعلم حیث یجعل رسالتہ کہ اللہ خوب جانتا ہے، وہ کسے رسُول بنائے گا۔

گروہِ انبیاء میں سے کوئی نبی قسط وار نبی نہیں بنا۔ نبی تو وہ ازل ہی سے ہوتا ہے۔ جب خدا تعالےٰ کی طرف سے اذن ہوتا ہے، وہ اپنی نبوت کا اعلان فرما دیتا ہے۔ جیسا کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام نے پنگھوڑے سے اپنی والدہ کی برّیت اور اپنی نبوت کا اعلان فرمایا۔ یا حضور حبیبِ کبریا علیہ الصلوٰۃ والثنا نے اذن پاتے ہی لوگوں پر یہ حقیقت واشگاف کر دی حالانکہ آپ اُس وقت بھی نبی تھے جب حضرت آدمؑ مٹی اور پانی کے درمیان تھے۔ لیکن مرزا غلام احمد قادیانی نے پہلے اپنے آپ پر الہام ہونے کا دعویٰ کیا، پھر مجدد بنے۔ پھر بیعت لینا شروع کی، پھر مسیح موعود اور مہدی ہونے کا دعویٰ کیا اور آخر میں ان پر انکشاف ہوا کہ وہ "نبی" ہیں۔ "تاریخ احمدیت" میں ہے: "۱۹۰۰ کے آخر اور ۱۹۰۱ کے اوائل میں سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام (؟) پر یہ انکشاف ہُوا کہ مقامِ نبوت صرف کثرتِ مکالمہ و مخاطبہ سے مشرف ہونے کا نام ہے اور نئی شریعت کا لانا، پہلی شریعت کا ترمیم کرنا یا براہِ راست منصبِ نبوت و رسالت کا حصول، نبی کی تعریف میں داخل نہیں ہے۔" (تاریخِ احمدیت جلد سوم۔ مرتبہ دوست محمد شاہد۔ ص ۱۹۸) تعریفِ نبوت کی تبدیلی کا سب سے پہلا تحریری اعلان ۵ نومبر ۱۹۰۱ء کو اشتہار "ایک غلطی کا ازالہ" (مشمولہ الحکم قادیان۔ ۱۰ نومبر ۱۹۰۱ ص ۵، ۷) کے ذریعے کیا گیا۔ دوست محمد شاہد نے اس کا ذکر کر کے حاشیے میں یہ وضاحت بھی کی ہے کہ پہلے ۱۹۰۰ء میں مولوی عبد الکریم اپنے خطباتِ جمعہ میں اس خیال کا اظہار کرتے

رہے۔ ۱۷ اگست ۱۹۰۰ کے خطبے میں مولوی صاحب نے مرزا صاحب کو مرسل ثابت کیا اور لا نفرق بین احد منھم والی آیت ان پر چسپاں کی جسے مرزا صاحب نے پسند کیا (تاریخ احمدیت۔ جلد سوم، ص ۱۹۲) یعنی ان کے نبی ہونے کا انہیں خود ابھی احساس نہیں ہوا تھا کہ مولوی عبدالکریم نے ان کی نبوت کو ثابت کرنا شروع کیا اور انہوں نے اس کو پسند فرما کر اپنی نبوت کا اعلان فرما دیا، چنانچہ مرزا بشیر الدین محمود احمد (مرزا صاحب کے بیٹے اور دوسرے "خلیفہ") لکھتے ہیں: "پس یہ ثابت ہے کہ ۱۹۰۱ سے پہلے کے وہ حوالے جن میں آپ نے نبی ہونے سے انکار کیا ہے اب منسوخ ہیں اور ان سے حجت پکڑنی غلط ہے۔" (حقیقۃ النبوۃ از میاں بشیر الدین محمود احمد ص ۱۲۱) ——— یعنی مرزا صاحب ایسے "نبی" ہیں جنھیں پہلے خود بھی پتا نہیں تھا کہ وہ کیا ہیں۔ وہ قسط وار ترقی کرتے رہے اور آخر کار مولوی عبدالکریم نے اپنے "خطبات جمعہ" کے ذریعے انہیں یقین دلا دیا کہ وہ نبی ہیں، چنانچہ وہ نبی بن بیٹھے۔

نبی کے لغوی معنی ہی غیب کی خبریں دینے والا کے ہیں۔ تمام انبیائے کرام غیب کی خبریں دیتے رہے، حضور فخر موجودات علیہ التحیۃ والصلوٰۃ بھی خدا تعالیٰ کی عطائے خاص سے معاملاتِ غیب پر مطلع کیے گئے تھے اور عالم ماکان و مایکون تھے۔ سب کچھ ان کے سامنے آئینہ تھا اور کتبِ احادیث میں ایسے واقعات بکھرے ہوئے ہیں کہ سرکارؐ نے لوگوں کو غیب کی خبریں دیں۔ مثلاً قرآن کریم نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے ۶۱۵ء میں جبکہ ایران کی عظمت کا ڈنکا بج رہا تھا اور سلطنتِ روم کمزور تھی، یہ خبر دلوائی کہ اگرچہ رومی مغلوب ہو گئے لیکن اس شکست کے بعد عنقریب چند سال میں وہ غالب آ جائیں گے (سورہ روم) اور دنیا جانتی ہے کہ ۶۲۳ء میں اہلِ روم پارسیوں پر غالب آ گئے۔ ۶ھ ہجری میں مسلمان پریشان حال تھے، حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "بے شک اگر اللہ نے چاہا تو ضرور تم لوگ بے خوف و خطر مسجد حرام میں داخل ہو گے۔" (سورہ فتح) اور ۸ھ ہجری میں مسلمان مکہ معظمہ میں فاتحانہ حیثیت سے داخل ہو گئے۔ ۱۲ رمضان المبارک ۲ھ ہجری کو حضور نورِ مجسم صلے اللہ علیہ وسلم نے جنگ بدر

کے موقع پر فرمایا۔ میرا رب ارشاد فرماتا ہے کہ ان یقاتلوکم یولوکم الادبار اگر اہلِ مکہ تم سے لڑیں گے تو پیٹھ پھیر لیں گے (سورہ آلِ عمران) تاریخ شاہد ہے کہ جنگ بدر میں مسلمانوں کو عظیم الشان کامیابی نصیب ہوئی۔

مختلف احادیثِ مبارکہ میں بے شمار ایسے واقعات ہیں جن کے وقوع سے پہلے سرکارِ دوعالم صلے اللہ علیہ وسلم نے خبر دے دی تھی اور وہ حضورؐ کی دی ہوئی خبر کے عین مطابق وقوع پذیر ہوئے۔ مثلاً خزیم بن اوس سے روایت ہے کہ حضورؐ نے حیرہ کے فتح ہونے کی خبر دی اور حضرت ابو بکر صدیقؓ کے زمانے میں حیرہ فتح ہوا۔ حضرت ابوذر، حضرت کعب بن مالک، حضرت ام سلمہ، حضرت ابو ہریرہ اور حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہم) کی روایتیں ملتی ہیں کہ سرکارؐ نے مصر کے فتح ہونے اور وہاں پیش آنے والے واقعات کی خبر دی۔ حضرت ابو ہریرہ، حضرت جابر بن سمرہ اور حضرت حسن (رضی اللہ عنہم) کی روایتیں کتبِ احادیث میں موجود ہیں کہ حضورؐ نے کسریٰ اور قیصر کے ہلاک ہونے کی خبر دی، یہ بھی فرمایا کہ ان کے خزانے مالِ غنیمت بن جائیں گے اور ان کے بعد کسریٰ اور قیصر نہیں ہوں گے۔ بہت سی احادیث ہیں کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت ثابت بن قیس بن شماسؓ، حضرت رافع بن خدیجؓ، ام ورقہؓ، عمار بن یاسرؓ، نعمان بن بشیرؓ، اور حضرت امام حسین (رضی اللہ عنہم) کی شہادت کی خبر دے دی تھی اور اس سلسلے میں واقع ہونے والے بہت سے واقعات بتا دیئے تھے۔ حضرت عمرؓ اور حضرت عبدالرحمٰنؓ بن ابی لیلیٰ سے کئی حدیثیں مروی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اویس قرنیؓ کے بارے میں معلومات مہیا فرما دی تھیں جو بعد میں اسی طرح سامنے آئیں۔ بخاری شریف میں حضرت ابوبکرہ سے روایت ہے کہ حضور رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے حضرت حسنؓ کے بارے میں فرمایا کہ میرا یہ بیٹا سید ہے اور یقیناً اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے مسلمانوں کے دو گروہوں میں صلح کرا دے گا۔

حضور حبیب کبریا علیہ التحیۃ والثناء نے ہزارہا معاملات میں پہلے سے خبر دی

جو سن و عن درست ثابت ہوئی۔ اس سلسلے میں بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں سے ایک خصائص الکبریٰ فی معجزات خیر الوریٰ، علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ تعالےٰ کی ہے جس میں ہزارہا ایسے واقعات جمع کر دیے ہیں۔ نمونے کے طور پر چند واقعات کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔ حضورؐ نے شام میں پھیلنے والے طاعون کی خبر دی۔ حضرت زید بن ارقمؓ کے طویل عمر پانے اور نابینا ہونے کی خبر دی۔ آپؐ نے خبر دی کہ چوتھی صدی میں لوگ بدل جائیں گے۔ آپ نے خوارج کی خبر دی۔ بغداد کی تعمیر کی خبر دی۔ غرض مخبر صادقؐ نے مختلف معاملات میں جو جو کچھ اپنے نام لیوا رفقا کے سامنے فرمادیا، وہ درست ثابت ہُوا۔

لیکن حضور صلے اللہ علیہ وسلّم کے بعد جن کذابوں نے نبوت کا دعویٰ کیا انہوں نے بھی اپنے آپ کو نبی ثابت کرنے کی کوشش میں بہت سی پیشگوئیاں کیں۔ دیکھنا چاہیئے کہ ان پیشگوئیوں کا کیا حال ہُوا۔ مسیلمہ کذاب نے ۷ ربیع الاوّل سنہ ہجری کو پیشگوئی کی کہ "محمدؐ ایک مہینے کے بعد فوت ہو جائیں گے اور اسلام کا آفتاب غروب ہو جائے گا اور بے شک یہ کلام آسمانی فضل سے نازل ہُوا ہے" (میزان الادیان۔ جلد اوّل۔ ص ۱۹۸) دُنیا جانتی ہے کہ حضور محبوبِ کبریا علیہ الصلوٰۃ والثنا ۱۲ ربیع الاوّل سلہ ہجری تک اس دُنیا میں رونق افروز رہے اور مسیلمہ کذّاب ٹھہرا۔

اسود عنسی نے ۲۷۔ جمادی الثانی سلہ ہجری کو یہ کہا کہ "اسلام تین سال کے بعد مٹ جائے گا اور میں یہ پیشگوئی خالق ارض و سما کے حکم سے کر رہا ہوں" (میزان الادیان۔ جلد اوّل۔ ص ۱۹۶) کسے معلوم نہیں کہ اسلام آج تک موجود ہے۔ سجاح نے ۵ ذی قعدہ سلہ ہجری کو یہ پیشگوئی کی کہ حکومتِ روم دو سال کے بعد عرب پر غالب آجائے گی اور یہ خبر نسیم آسمانی نے پہنچائی ہے" (تاریخ ابوالفدا۔ جلد چہارم۔ ص ۲۱۱) اس خبر کا حشر بھی دُنیا جانتی ہے۔

المقنع نے ۶ اکتوبر ۷۵۹ء کو پیشگوئی کی کہ ابُو مسلم خراسانی دو سال کے بعد یقیناً ہلاک ہو جائے گا (تاریخ العرب۔ ص ۳۴۴) تاریخی شواہد سامنے ہیں کہ ابُو مسلم خراسانی

۲ نومبر ۷۸۴ء تک زندہ رہا۔ قرمط نے ۲۳ مارچ ۹۲۸ء کو خبر دی کہ "دو مہینے کے بعد آفتاب مشرق کے بجائے مغرب سے طلوع ہو گا اور بے شک یہ ایک عجیب بات ہے" (میزان الادیان۔ جلد اوّل۔ ص ۲۱۸) ظاہر ہے کہ یہ خبر جھوٹ نکلی۔ مرزا علی محمد باب نے ۵ اپریل ۱۸۴۸ء کو شاہِ ایران کے دو سال بعد ہلاک ہونے کی پیشگوئی کی لیکن وہ ۱۸۵۶ء تک زندہ رہا۔

مرزا غلام احمد قادیانی نے ۴۔ ۱۹۰۴ء میں پیشگوئی کی کہ "مولوی ثناء اللہ امرتسری ایک مہینے کے بعد ضرور مر جائے گا اور یہ مجھے وحی کے ذریعے سے معلوم ہُوا ہے" (مجموعہ اشتہارات۔ جلد اوّل۔ مرزا غلام احمد قادیانی۔ ص ۱۹۸) مرزا صاحب تو یہ پیشگوئی کر کے ۱۹۰۸ء میں مر گئے۔ لیکن ثناء اللہ امرتسری قیام پاکستان کے بعد ۱۹۴۸ء میں فوت ہوئے۔ مرزا صاحب نے ۱۸۹۱ء میں کہا کہ عرشِ اعظم پر محمدی بیگم کے ساتھ میرا نکاح ہو چکا ہے اور میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ وہ اس دُنیا میں ضرور میرے نکاح میں آئے گی۔ لیکن ہُوا یہ کہ وہ آخر دم تک محمدی بیگم کی زیارت سے محروم ہی رہے۔ اسی طرح انہوں نے عیسائی پادری آتھم کی موت کے بارے میں کہا کہ وہ ۵ دسمبر ۱۸۹۴ء تک مر جائے گا لیکن وہ زندہ رہا اور عیسائیوں نے اس کا بڑی شان و شوکت سے جلوس نکالا۔ مرزا صاحب نے زندگی میں بہت پیشگوئیاں کیں اور ان کا انجام یہی ہُوا۔ لیکن انہوں نے اپنے بارے میں جو پیشگوئی فرمائی تھی، اس کا حال دیکھیے۔ کہا۔ "بشارت ہوئی کہ عمر اسّی سال ہو گی یا اس سے زیادہ" (مواہب الرحمٰن۔ از مرزا غلام احمد قادیانی۔ ص ۲۱) لیکن ہوا یہ کہ اڑسٹھ سال کی عمر ہی میں مر گئے۔ ۱۹۰۷ء میں انہوں نے اس الہام کا دعویٰ کیا کہ "فرمایا کہ میں تیری عمر کو بڑھا دوں گا۔ یعنی دشمن جو کہتا ہے کہ صرف جولائی ۱۹۰۷ء میں چودہ مہینے تک تیری عمر کے دن رہ گئے ہیں یا ایسا ہی دوسرے دشمن پیشگوئی کرتے ہیں، ان سب کو جھوٹا کروں گا اور تیری عمر کو بڑھا دوں گا تا معلوم ہو کہ میں خدا ہوں اور ہر ایک میرے اختیار میں ہے" (تبلیغ رسالت جلد دہم۔ ص ۱۳۲) لیکن عمر نہ بڑھی اور اللہ نے "مخالفین" ہی کی بات سچ کر دکھائی۔ مرزا صاحب

مئی ۱۹۰۸ء سے آگے نہ بڑھے۔ اس کے باوجود مرزا صاحب کا دعویٰ ملاحظہ ہو: "میں سچ سچ کہتا ہوں کہ جس کثرتِ تعداد اور صفائی سے غیب کا علم حضرت جل شانہٗ نے اپنے ارادۂ خاص سے مجھے عنایت فرمایا، اگر دنیا میں اس کثرتِ تعداد اور انکشافِ تام کے لحاظ سے کوئی اور بھی میرے ساتھ شریک ہے تو میں جھوٹا ہوں۔" (تریاق القلوب مرزا غلام احمد قادیانی۔ ص ۱۴۷)

مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنے لیے "غیر مستقل نبوت" گھڑلی ہے، حالانکہ قرآن واحادیث کی رُو سے جو شخص وحی کا دعویٰ کرتا ہے، وہ نبوتِ مستقلہ کا دعویٰ کرتا ہے۔ کیونکہ غیر مستقل نبوت کا کوئی تصور نہیں ہے۔ لیکن مرزا صاحب نے اپنے لیے کبھی ظلی، کبھی بروزی نبی کی اصطلاح گھڑی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ کوئی نئی شریعت نہیں لائے، حضور سرکارِ دوعالم صلے اللہ علیہ وسلم کے اُمتی ہیں، اس لیے ظلی نبی ہیں۔ "(حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد) صرف اس نبوت کا دروازہ بند ہے جو احکامِ شریعتِ جدیدہ ساتھ رکھتی ہو یا ایسا دعویٰ ہو جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی اتباع سے الگ ہو کر کیا جائے۔ لیکن ایسا شخص جو ایک طرف خدا تعالےٰ کی وحی میں اُمتی قرار پاتا ہے، پھر دوسری طرف اس کا نام نبی بھی رکھتا ہے، یہ دعویٰ قرآن شریف کے احکام کے خلاف نہیں ہے۔ کیونکہ یہ نبوت بباعث اُمتی ہونے کے، دراصل آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا ایک ظل ہے، کوئی مستقل نبوت نہیں۔" (ضمیمہ براہینِ احمدیہ حصہ پنجم۔ مرزا غلام احمد قادیانی طبع اوّل ص ۱۸۱) اسی طرح "ازالۂ اوہام" میں لکھتے ہیں: "ہمیں جو کچھ ملتا ہے، ظلی اور طفیلی طور پر ملتا ہے۔" (جلد اوّل۔ ص ۱۳۸) "چشمۂ معرفت" میں ہے۔ "وہ نبوت جو اُس کی کامل پیروی سے ملتی ہے اور جو اُس کے چراغ سے نُور لیتی ہے، وہ ختم نہیں۔" (ص ۳۲۴)

قادیانیوں نے بھی مرزا صاحب کی نبوت کو ظلی کہا ہے لیکن ان کا مرتبہ سب انبیا سے بڑا بتایا ہے۔ "حضرت مسیح موعود علیہ السلام (؟) نبی تھے۔ آپ کا درجہ مقام کے لحاظ سے رسولِ کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا شاگرد اور آپ کا ظل ہونے کا

ہے۔ دیگر انبیا علیہم السلام میں سے بہتوں سے آپ بڑے تھے، ممکن ہے سب سے بڑے ہوں۔" (الفضل قادیان ۲۹ اپریل ۱۹۲۷ء)

کبھی مرزا صاحب اپنی نبوت کو بروزی قرار دیتے ہیں۔ "اب بعد اس (خاتم الانبیا) کے کوئی نبی نہیں مگر وہی جس پر بروزی طور سے محمدیت کی چادر پہنائی گئی ہو۔ ۔ ۔ ۔ پس جو کامل طور پر مخدوم میں فنا ہو کر خدا سے نبی کا لقب پاتا ہے وہ ختمِ نبوت کا مخل انداز نہیں۔" (کشتیٔ نوح۔ مرزا غلام احمد قادیانی۔ ص ۲۴) "البدر" کی ۲۴ ستمبر ۱۹۰۲ء کی اشاعت میں کسی نے مرزا صاحب سے پوچھا کہ بروز کسے کہتے ہیں۔ اُنہوں نے کہا۔ "جیسے شیشہ میں انسان کی شکل میں آتی ہے، حالانکہ وہ شکل بذاتِ خود الگ قائم ہوتی ہے، اس کا نام بروز ہے۔" (ملفوظات۔ جلد ششم۔ مرزا غلام احمد قادیانی۔ ص ۱۲۲)

مرزا صاحب نے اپنی بیویوں کو "امہات المومنین" قرار دیا، اپنے گھر والوں کو "اہلِ بیت" کہا، جن لوگوں نے مرزا صاحب کی زیارت کی، انہیں "صحابہ" بنایا۔ اسی قسم کے ایک "صحابی" سید سرور شاہ قادیانی کہتے ہیں۔ "بروز کے معنی حضرت مسیح موعود علیہ السلام (؟) نے خود لکھے ہیں کہ اصل اور بروز میں فرق نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ جب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غلامی کی نسبت بیان کرتے ہیں تو فرماتے ہیں۔ "من یک قطرہ زآبِ زلالِ محمدم"۔ لیکن جب آپ بروزی رنگت میں جلوہ نما ہوتے تو فرماتے۔ "من فرق بینی المصطفیٰ فما عرفنی وما رأی" کہ جو مجھ میں اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم میں ذرا بھی فرق کرتا ہے، اس نے نہ مجھے دیکھا اور نہ مجھے پہچانا۔" (اخبار الفضل قادیان۔ ۲۶ جنوری ۱۹۱۶ء)

مرزا غلام احمد قادیانی نے جس طرح بتدریج ترقی کی، اس کی طرف توجہ دلائی جا چکی ہے لیکن یہ سمجھنا کہ مرزا صاحب کی وفات کے بعد "ارتقا" کا یہ عمل جاری نہیں رہا، درست نہیں۔ مرزا صاحب تو ایک مولوی سے ترقی کی منازل طے کرتے کرتے ظلی، بروزی اور نئی شریعت کے بغیر نبی بنے۔ لیکن ان کے صاحبزادے نے ظلی، بروزی والا نیا

بھی اڑادی۔ انہوں نے والد صاحب کو "حقیقی نبی" قرار دیا۔ "درحقیقت خدا کی طرف سے خدا تعالیٰ کی مقرر کردہ اصطلاح کے مطابق قرآنِ کریم کے بتائے ہوئے معنی کی رُو سے جو نبی ہو، اور نبی کہلانے کا مستحق ہو، تمام کمالاتِ نبوت اُس میں اس حد تک پائے جاتے ہوں جس حد تک نبیوں میں پائے جانے ضروری ہیں تو میں کہوں گا کہ ان معنوں میں حضرت مسیح موعود حقیقی نبی تھے"۔ (القول الفیصل۔ میاں بشیر الدین محمود احمد ص ۱۲) خود مرزا صاحب نے لکھا۔ "یہ بھی تو سمجھو کہ شریعت کیا چیز ہے۔ جس نے اپنی وحی کے ذریعہ سے چند امر و نہی بیان کیے اور اپنی اُمت کے لیے ایک قانون مقرر کیا، وہی صاحبِ شریعت ہو گیا۔ میری وحی میں امر بھی ہے اور نہی بھی اور اگر کہو کہ شریعت سے وہ شریعت مراد ہے جس میں نئے احکام ہوں، تو یہ باطل ہے"۔
(اربعین نمبر ۴۔ ص $\frac{۴۵}{۸۴}$)

اب مرزا صاحب کی وحی یا کسی کے اُن پر کیے گئے "الہامات" کا ذکر بھی ہو جائے۔ خداوندِ قدوس نے تو فرمایا تھا۔ وما ارسلنا من رسول الا بلسان قومہ (ہم نے ہر رسُول پر صرف اس کی قوم کی زبان میں وحی نازل کی) لیکن مرزا صاحب پر کئی زبانوں میں "وحی" نازل ہوئی۔ اگرچہ انہوں نے خود کہا تھا "یہ بالکل لغو اور بیہودہ امر ہے کہ انسان کی اصل زبان کوئی اور ہو اور الہام اس کو کسی اور زبان میں ہو"۔ (چشمہ معرفت۔ مرزا غلام احمد قادیانی ص ۲۰۹) بیشتر "الہامات" اس قسم کے ہیں کہ قرآنی آیات میں کچھ تحریف کر کے مرزا صاحب والا الہام بن گیا۔ کچھ الہامات معنوی لحاظ سے عجیب و غریب ہیں۔ مثلاً انت منی بمنزلۃ ولدی (تو مجھ سے بیٹے کی بجا ہے) اس سوال کے جواب میں کہ اس الہام کے معنی کیا ہیں، قادیانی حضرات کا موقف ہے کہ کسی کو "بیٹے کی بجا" کہنا پیار کے اظہار کے لیے ہوتا ہے، ورنہ خود مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ خدا بیٹوں سے پاک ہے۔ نہ اُس کا کوئی شریک ہے اور نہ بیٹا ہے لیکن یہ فقرہ اس جگہ قبیل مجاز اور استعارہ میں ہے (جماعتِ احمدیہ سے متعلق بعض سوالات کے جوابات۔ ص ۳۹) بہرحال مرزا صاحب کے خدا نے تو انہیں بیٹے کی بجا کہہ ہی

دیا نا!

قرآنِ پاک میں تحریف کرتے ہوئے مرزا صاحب کے "خدا" نے بعض جگہوں پر زبان غلط کر دی ہے۔ قرآن نے کہا تھا۔ "یا آدم اسکن"۔ مرزا صاحب کے "الہام" میں مخاطب عورت ہو گئی لیکن فعل مذکر ہی رہا۔ "یا مریم اسکن" (حرفِ محرمانہ۔ از ڈاکٹر غلام جیلانی برق ص ۳۲۵، ۳۲۴) ——— اور مرزا صاحب کا "خدا" تو کوئی سی زبان بھی صحیح استعمال نہیں کرتا۔ اردو الہام دیکھیے "بہت سے سلام میرے تیرے پر ہوں"۔ (حقیقۃ الوحی۔ مرزا غلام احمد قادیانی۔ ص ۱۰۲) ان پر جو الہامات انگریزی میں نازل ہوئے، ان کی زبان بھی اتنی ہی غلط ہے جتنی مرزا صاحب جیسے "پڑھے لکھے" آدمی کی ہونی چاہیے تھی (مثلاً دیکھیے حقیقۃ الوحی۔ مرزا غلام احمد قادیانی ص ۳۰۳) انگریزی الہامات کے بارے میں حاشیے میں لکھتے ہیں۔ "چونکہ یہ غیر زبان میں الہام ہے اور الہامِ الٰہی میں ایک سرعت ہوتی ہے۔ اس لیے ممکن ہے کہ بعض الفاظ کے ادا کرنے میں کچھ فرق ہو اور یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ بعض جگہ خدا تعالیٰ انسانی محاورات کا پابند نہیں ہوتا (حقیقۃ الوحی۔ ص ۳۰۴) ایک خط میں اس سلسلے میں شکوہ کرتے ہیں کہ "چونکہ اس ہفتے میں بعض کلمات انگریزی وغیرہ الہام ہوئے ہیں اور اگرچہ بعض ان میں سے ہندو لڑکے سے دریافت کیے مگر قابلِ اطمینان نہیں"۔
(مکتوباتِ احمدیہ، جلد اوّل۔ ص ۶۸)

اور پھر انگریزی الہامات ہی پر کیا منحصر ہے سنسکرت اور عبرانی وغیرہ میں بھی ان پر یہ عنایات ہوتی رہیں۔ لکھتے ہیں۔ "زیادہ تر تعجب کی بات یہ ہے کہ بعض الہامات مجھے ان زبانوں میں بھی ہوتے ہیں جن سے مجھے کچھ بھی واقفیت نہیں ہے جیسے انگریزی، سنسکرت یا عبرانی وغیرہ"۔ (نزول المسیح۔ ص ۵۷)

مرزا صاحب کا نام "غلام احمد" تھا۔ لیکن ان کے کئی "الہامات" میں انہیں "احمد" کے نام سے پکارا گیا۔ خود انہوں نے اپنے بارے میں کہا۔

احمدِ آخر زماں نام من است
آخریں جامے ہمیں جام من است

لیکن وہ خود اس حوالے سے ارتقائی منازل ہی طے کرتے رہے۔ انہوں نے خود یہ اعلان نہیں کیا کہ "۔۔۔ من بعدی اسمہٗ احمد" کی آیت کے مصداق حضور پُر نور صلے اللہ علیہ وسلّم نہیں بلکہ وہ خود ہیں۔ یہ بات تو ان کے بیٹے اور خلیفہ دوم نے کہی۔ "اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون رسول ہے جو حضرت عیسٰی علیہ السّلام کے بعد آیا اور اس کا نام احمد ہے۔ میرا اپنا دعویٰ ہے اور میں نے یہ دعویٰ یوں ہی نہیں کر دیا بلکہ حضرت مسیح موعود کی کتابوں میں بھی اسی طرح لکھا ہُوا ہے اور حضرت خلیفۃ المسیح اوّل (حکیم نورالدین بھیروی) نے بھی یہی فرمایا ہے کہ مرزا صاحب احمد ہیں۔ چنانچہ ان کے درسوں کے نوٹوں میں بھی یہی چھپا ہوا ہے اور میرا ایمان ہے کہ اس آیت (اسمہٗ احمد) کے مصداق حضرت مسیح موعود علیہ السّلام (؟) ہی ہیں (انوارِ خلافت میاں بشیر الدین محمود احمد۔ ص ۲۱) مرزا بشیر الدین محمود احمد نے ۱۹۱۵ء کے سالانہ جلسے میں تقریر کرتے ہوئے کھل کر کہا کہ "اسمہٗ احمد" سے حضور محبوب خدا علیہ التحیۃ والثنا مراد نہیں ہیں (الفضل قادیان۔ ۱۹ر اگست ۱۹۱۶)

حالانکہ خود مرزا صاحب نے ۴ر نومبر ۱۹۰۰ء کو "اشتہار واجب الاظہار" میں کہا تھا: "ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلّم کے دو نام تھے۔ ایک محمد صلی اللہ علیہ وسلّم۔ دوسرا احمد صلی اللہ علیہ وسلّم ۔۔۔۔۔۔ اسم احمد جمالی نام تھا جس سے یہ مطلب تھا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلّم دُنیا میں آشتی اور صلح پھیلائیں گے۔ سو خدا نے ان دو ناموں کی اس طرح پر تقسیم کی کہ اوّل آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلّم کی مکّی زندگی میں اسم احمد کا ظہور تھا اور ہر طرح سے صبر اور شکیبائی کی تعلیم تھی اور پھر مدینہ کی زندگی میں اسم محمد کا ظہور ہوا اور مخالفوں کی سرکوبی خدا کی حکمت اور مصلحت نے ضروری سمجھی (تبلیغ رسالت جلد نہم۔ مرزا غلام احمد قادیانی۔ ص ۹۱)

معلوم ہوا کہ مرزا صاحب تو "احمد" حضور صلے اللہ علیہ وسلّم کا اسم مبارک سمجھتے

تھے لیکن ان کے بیٹے ان سے بھی دو قدم آگے نکل گئے۔ انہوں نے واضح طور پر کہا کہ احمد حضور صلے اللہ علیہ وسلّم کا نام نہیں تھا اور "احمد" کے سلسلے میں قرآن میں جو نشانات ہیں حضور اُن کے مصداق بھی نہیں ہیں اور نہ ہی حضور نے خود یہ فرمایا کہ "اسمہٗ احمد" والی پیشگوئی میرے بارے میں ہے (الفضل۔ ۱۹ر اگست ۱۹۱۶)

مرزا صاحب نے بھی "خاتم" کے معنی مُہر کہہ کر حضور رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی مُہر کے ذریعے نبوت کی راہ کھولنی چاہی تھی۔ ان کے صاحبزادے نے بات کو اور بھی واضح کر دیا۔ ۱۹۲۷ میں اُن سے سوال کیا گیا کہ کیا آئندہ بھی نبیوں کا آنا ممکن ہے تو انہوں نے کہا، "ہاں، قیامت تک رسول آتے رہیں گے۔ جب تک بیماری ہے تب تک ڈاکٹر کی بھی ضرورت ہے۔" (الفضل قادیان۔ ۲۷ر فروری ۱۹۲۷)

مرزا صاحب نے اپنے آپ کو بہت کچھ بنا لیا تھا۔ وہ مسیح موعود بن بیٹھے تھے (حیاتِ طیبہ از عبد القادر۔ ص ۹۸۔ تاریخ احمدیت جلد سوم۔ ص ۵۳۶۔ تتمہ حقیقۃ الوحی ص ۶۴ ۔۔۔ وغیرہ) انہوں نے اپنے آپ کو آدمؑ، شیثؑ، نوحؑ، ابراہیمؑ، اسحاقؑ، اسمٰعیلؑ، یعقوبؑ، یوسفؑ اور حضور صلے اللہ علیہ وسلّم کا مظہر اتم کہا (حقیقۃ الوحی ص ۷۲) انہوں نے اپنے آپ کو کرشن بھی قرار دیا (تتمہ حقیقۃ الوحی۔ ص ۸۵) وہ "مہدی معہود" بھی بن بیٹھے (سیرت المہدی۔ حصہ سوم۔ ص ۱۶۹، ۱۷۰۔ ملفوظات جلد ششم۔ ص ۴۲۳ ۔۔۔۔۔ وغیرہ) لیکن انہوں نے کہا کہ مہدی ایک ہی ہونا تھا اور وہ خود اُن کی صورت میں "ہو گیا"۔ ۱۷ر جنوری ۱۹۰۳ء کو ایک مقدمے کے سلسلے میں جہلم پیش ہوئے تو خدام کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا۔ "مسلمانوں کے تمام فرقے مہدی کے منتظر ہیں۔ مگر مہدی تو بہر حال ایک شخص ہی ہونا تھا اور وہ میں ہوں"۔ (سیرت المہدی۔ حصہ سوم۔ ص ۱۶۹) لیکن "طنبورۂ مرزا" کچھ اور کہتا ہے۔ ان کے بیٹے صاحب حسبِ عادت ان سے کئی ہاتھ آگے نکل گئے۔ کہتے ہیں۔ "مہدی کے متعلق جو پیشگوئیاں ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ کئی مہدی ہوں گے۔ ان مہدیوں میں سے ایک مہدی تو خود حضرت مرزا صاحب ہیں اور آئندہ بھی کئی مہدی آ سکتے ہیں"۔ (الفضل قادیان۔ ۲۷ر فروری ۱۹۲۷ء)

دُنیا جانتی ہے کہ نبی جھوٹ نہیں بولتا، سچا ہوتا ہے۔ آقا صلے اللہ علیہ وسلم کو آپ کے سخت ترین دُشمن بھی صادق اور امین کہہ کر پکارتے تھے۔ قرآنِ مجید میں انبیاءِ کرام کے صدق کو کئی مقامات پر بیان کیا گیا ہے۔ لیکن جس نبوّت کی بُنیاد ہی جھوٹ پر ہو، جو شخص جھوٹی نبوّت کا داعی ہو، اس کے کلام میں سچ کی تلاش کرنا ہی بے وقوفی ہے۔ لیکن مرزا صاحب کے "سچ" کی ایک مثال ضرور ملاحظہ فرمائیں لکھتے ہیں۔ "بخاری میں لکھا ہے کہ آسمان سے اس کے لیے آواز آئے گی کہ ھذا خلیفۃ اللہ المھدی۔ اب سوچو کہ یہ حدیث کس پائے اور مرتبے کی ہے جو اس کتاب میں درج ہے جو اصح الکتب بعد از کتاب اللہ ہے (شہادت القرآن۔ مرزا غلام احمد قادیانی ص ۴۱)

صورتِ حال یہ ہے کہ بخاری شریف میں ایسی کوئی حدیث نہیں ہے۔

اس مختصر مضمون میں یہ بات اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ جن لوگوں نے دین کے محل میں نقب لگانے کی جسارت کی، حضور خاتم النبیین صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد اپنی نبوّت کا کھڑاگ کھڑا کیا، انہوں نے اگرچہ شیطان کے زیرِ اثر کئی لوگوں کو بوجوہ اپنے چنگل میں پھنسا لیا، لیکن ان کا جھوٹ ان کی ایک ایک ادا سے، ان کی ایک ایک عبارت سے واضح ہے۔ اب جن لوگوں کے دلوں، کانوں اور آنکھوں پر اللہ نے مُہر لگا دی ہو، ان پر احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کی کسی کوشش کا مثبت اثر تو ہونے سے رہا۔ مگر ایسے لوگ جو متلاشیانِ حق ہیں، انہیں ضرور غور کرنا چاہیئے کہ شیطان کے چیلے چانٹے دین کو کمزور کرنے اور ملّت کو پارہ پارہ کرنے کی کوششوں میں کس کس طرح مصروف ہیں۔

سرکار صلی اللہ علیہ وسلم کی محبّت

حضورِ فخرِ موجودات سرورِ کائنات علیہ السّلام والصلوٰۃ سے پہلے جتنے بھی انبیائے کرام مبعوث ہُوئے، تاریخ شاہد ہے کہ ان کے ماننے والوں نے جانثاری اور جاں سپاری کے ایسے مظاہر پیش نہیں کیے جو حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کے چاہنے والوں نے دنیا کو دکھائے۔ وہ نفوسِ قدسیہ بھی جنھوں نے ایمان کی آنکھوں سے اپنے آقا و مولا علیہ التحیۃ والثنا کی زیارت کی، سرکارؐ کی عزت و ناموس پر سختیاں اُٹھاتے، صعوبتیں جھیلتے اور جانیں نچھاور کرتے رہے۔ یہ بھی ہُوا کہ کفار نے اُنہیں آقا حضور صلے اللہ علیہ وسلّم کے سایۂ رحمت سے نکالنا چاہا، آقا سے محبّت ترک کر دینے کے مشورے دیئے، اُن کے دامنِ کرم سے علیحدہ کرنے کی کوشش کیں ــــ لیکن وابستگانِ درِ مصطفٰےؐ نے کسی صُورت بھی اس محرومی کو گوارا نہ کیا۔ دُشمنانِ دین نے انہیں تکلیفیں پہنچائیں، انہیں شہید بھی کر دیا تو چشمِ فلک نے دیکھا کہ تا دمِ واپسیں ان کی زبانیں ذکرِ نبیؐ میں لال تھیں اور ان کے ہونٹ مدحِ مصطفٰےؐ میں مصروف رہے۔ صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) نے اپنی جانیں دے بھی دیں، کہ انہیں دامنِ سرکارؐ سے ناوابستگی کے عالم میں ایک لمحہ حرام تھا اور انھوں نے ایسے بد بختوں کی جانیں لیں بھی، جن سے حضور صلے اللہ علیہ وسلّم کی توہین کا ارتکاب ہُوا۔

صحابہ کرام کی جماعت تو وہ جماعت ہے جن سے اللہ تعالےٰ نے اپنے راضی ہونے کا اعلان فرمایا اور اُن کے اللہ سے راضی ہونے کی خبر سُنائی۔ لیکن عزت و ناموسِ سرکارِ دوعالم (صلی اللہ علیہ وسلّم) پر جان دینے کی یہ رسم اُن کے بعد بھی ہر دور کے اہلِ ایمان نے زندہ رکھی۔ حتّٰی کہ آج کے دورِ پُر فتن میں بھی جانثارانِ ناموسِ رسالتؐ کی کمی نہیں۔ ظفر علی خاں نے کہا تھا۔

نماز اچھی، حج اچھا، روزہ اچھا اور زکوٰۃ اچھی
مگر میں باوجود اس کے مسلماں ہو نہیں سکتا
نہ جب تک کٹ مروں میں خواجۂ یثرب[1] کی عزت پر
خدا شاہد ہے، کامل میرا ایماں ہو نہیں سکتا[2]

لاہور کے ایک بقضلہٖ بقیدِ حیات شاعر نے کہا۔

ہم اپنے دین پر جان اپنی وار سکتے ہیں
ہمارے دین کا مطلب ہے آبروئے رسولؐ[3]

چنانچہ اسلامیوں کی پوری تاریخ شاہد ہے کہ جب کسی خرِنا شخص نے محسنِ عالم حضور رسولِ انام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شان میں کوئی گستاخی کی، کسی غازی نے اپنا فرض نبھا دیا۔ جہاں کسی بدبخت کو "کُتے" کی موت مرنا پسند آیا، اس نے محسنِ کائنات علیہ السلام والصلوٰۃ کے بارے میں کوئی نامناسب اور نازیبا لفظ کہنے کی جسارت کر لی اور اس کا نتیجہ بھگت لیا۔

ایک تو یہ ہمارے لیے جذباتی مسئلہ ہے کہ جس ہستی نے ہمیں سچائی کی راہ دکھائی، ہمیں ہمارے معبودِ حقیقی کے در پر جھکایا، ہماری دُنیوی اور اُخروی بہتری کے لیے بہت کچھ کیا، ہمیں بھی سمجھایا اور خالق و مالکِ حقیقی جل شانہٗ سے ہمیں بہت سی مراعات بھی لے کر دیں —— اس ہستی کی عظمت سے فروتر بات ہم کیسے برداشت کریں۔ کوئی بدبخت ہمارے آقا و مولا حضور رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی توہین کا ارتکاب کرے، حضور کی شان میں کسی گستاخی کا مرتکب ہو اور اسے ہم سزا نہ دیں، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ لیکن دیکھنا چاہیے کہ جذباتیت سے ہٹ کر اس کا علمی پہلو کیا ہے ——

---

[1] مدینہ طیبہ
[2] ظفر علی خاں۔ بہارستان۔ مکتبۂ کارواں لاہور۔ ص ۔ نظم "تکمیلِ ایمان" کے پہلے دو شعر
[3] صابر گیلانی

ایمان کی بنیاد محبتِ رسولؐ ہے۔ مشہور حدیثِ پاک ہے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں، آقا و مولا علیہ التحیۃ والثنا نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک وہ مجھ سے اپنے باپ، اپنی اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبت نہ کرتا ہو[1] چنانچہ مسلمان ہونے کی شرطِ اوّلیں سرکارؐ کی محبت ٹھہری اور محبت بھی کیسی —— جتنی اور کسی سے ہو نہ سکتی ہو۔ اتنی گہری اور والہانہ محبت، کہ اس کے سامنے سب محبتیں ہیچ ہوں، سب تعلق منقطع ہوتے دکھائی دیں۔

محبت ہوتی ہے تو اس کے کچھ تقاضے بھی ہوتے ہیں۔ محب اپنے محبوب کی تعریف کرتا ہے، اسے نام سے پکارنے کے بجائے پیار کے خطابات اور خوبصورت القابات سے پکارتا ہے، اس کی بات مانتا ہے۔ محبوب کی تکلیف اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہوتی ہے، وہ محبوب کو خوش کرنا چاہتا ہے۔ وہ ان لوگوں کو عزیز رکھتا ہے جنہیں اس کا محبوب عزیز رکھتا ہو۔ وہ دوسروں کو یقین دلاتا ہے کہ اس کا محبوب سب سے اچھا ہے۔ محب کبھی برداشت نہیں کرتا کہ کوئی اس کے محبوب کی توہین کرے اور وہ اپنے محبوب کے دشمنوں کو خائب و خاسر کرنے اور ذلیل کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتا۔

اس صورتِ حال کا جائزہ بھی لینا چاہیے کہ کیا واقعی خداوندِ قدوس ولایزال جل جلالہٗ بھی حضور سیدِ آدم و بنی آدم رحمتِ ہر عالم صلے اللہ علیہ وسلم سے محبت کرتا ہے؟ اگر محبت کے تقاضے کلام اللہ سے پورے ہوتے دکھائی دیں تو پھر جان لینا چاہیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بھی محبوب ہیں اور ہمیں اللہ کی سنت پر عمل کرتے ہوئے محبت کے تقاضے پورے کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس سے یہ بھی واضح ہوگا کہ جاں نثارانِ ناموسِ مصطفےٰ (علیہ التحیۃ والثنا) نے جو کارنامے انجام دیئے ان کی دینی، علمی اور تحقیقی حیثیت کیا ہے۔ انہوں نے اپنے ایمان کے کامل ہونے کا ثبوت کس طرح دیا اور سنتِ خداوندی پر کس حد تک عمل کیا۔

---

[1] بخاری

قرآنِ مجید حضور محبوبِ کبریا علیہ التحیۃ والثنا کی تعریف و ثنا سے بھرا پڑا ہے۔
اللہ کریم نے اپنے محبوب پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنے اور اپنے فرشتوں کے درود بھیجنے کا اعلان فرماتے ہوئے یہ حکم دیا کہ جو اہلِ ایمان ہیں، وہ بھی انہیں درود اور سلام کا ہدیہ پیش کریں (سورہ الاحزاب) انہیں حق کے ساتھ خوشخبری سنانے اور ڈرانے والا بنا کر بھیجنے کی بات کی (سورہ البقرہ) انہیں ایسا رسول فرمایا جنہیں لوگوں کا مشقت میں پڑنا گراں ہے، انہیں لوگوں کی بہت بھلائی چاہنے والے کہا اور مسلمانوں پر بہت کرم والے مہربان قرار دیا (سورہ توبہ)
خداوند تبارک و تعالیٰ نے اُس شہر کی قسم کھائی جس میں اس کے محبوب صلے اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے (سورہ بلد) اس نے اپنے پیارے کی جان کی قسم کھائی (سورہ حجر) اس کو اپنی قسم کھانا تھی تو اس کے لیے بھی فَلَا وَرَبِّكَ (سورہ نساء) فرمایا کہ اے محبوب! مجھے تیرے رب کی قسم! اس نے سرکار کو سارے جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجنے کا اعلان فرمایا۔ (سورہ انبیاء) اس نے نبی کریم علیہ التحیۃ والتسلیم کو مسلمانوں کی جانوں کے خود اُن سے زیادہ مالک قرار دیا اور فرمایا کہ ان کی بیویاں مسلمانوں کی مائیں ہیں (سورہ احزاب) اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں کو مخاطب کرکے فرمایا کہ تم اور عورتوں کی طرح نہیں ہو (سورۂ احزاب) اس نے حضور کو شاہد، مبشر، نذیر، اللہ کی طرف اس کے حکم سے بلانے والا اور چمکا دینے والا چراغ فرمایا (سورۂ احزاب) اس نے واضح فرما دیا کہ وہ جو بات اپنی خواہش سے فرماتے ہیں، وہ حقیقت میں وحی ہوتی ہے جو ان کو وحی کی جاتی ہے (سورہ النجم) اس نے اُن کی بیعت کو اللہ کی بیعت کہا، ان کے ہاتھ کو اللہ کا ہاتھ فرمایا (سورہ الفتح) اس نے محبوب (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے خلق کو عظیم کہا (سورہ القلم) اُس نے اپنے محبوب کے ذکر کو اُن کی خاطر بلند کرنے کا اعلان فرمایا۔ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ (سورۂ الم نشرح)
یہ تو قرآن پاک کے چند مقامات کی طرف اشارے کیے گئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کا یہ سارا کلام ہی اُس کے محبوب پاک صاحبِ لولاک صلی اللہ علیہ وسلم

کی نعت ہے۔ قرآنِ مجید نعت کا مجموعۂ اوّل ہے اور وہ جو غالب نے کہا تھا،

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتیم
کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمد است

کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتبے کو جاننے والی ذات صرف خداوندِ قدوس و کریم کی ہے، اس لیے وہی ثنائے خواجہ کر سکتا ہے۔ چنانچہ مذکورہ بالا اشارات سے ثابت ہوا کہ خدا تعالےٰ نے اپنے محبوب کی تعریف کی ہے۔ اب تعریفِ مصطفےٰ (علیہ التحیۃ والثناء) کا یہ انداز دیکھیے کہ اللہ تعالےٰ نے انہیں پورے قرآنِ مجید میں کہیں نام سے نہیں پکارا، کہیں یا ایھا النبی کہا ہے، کہیں یا ایھا الرسول پکارا ہے۔ پھر یا ایھا المزمل (سورہ مزمل) اور یا ایھا المدثر (سورہ مدثر) کہہ کر بھی خطاب کیا ہے کہ اے کپڑوں میں لپٹنے والے اور اے چادر اوڑھنے والے! کہیں انہیں چمکنے والا ستارہ کہا، کہیں ان کے چہرۂ مبارک کی قسم کھائی اور کہیں ان کی زلفِ معنبر کی غرضیکہ اپنے پیارے کو پکارنے کے لیے اپنائیت اور محبت کے اسلوب اختیار کیے ہیں۔
محبت کے دعویدار کیلئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اپنے محبوب کی بات بھی مانے۔ اس نقطۂ نظر سے کلام اللہ کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تمنا میں بار بار آسمان کی طرف دیکھا کہ بیت المقدس کے بجائے کعبۃ اللہ مسلمانوں کا قبلہ بن جائے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی اس ادا کا ذکر فرما کر فرمایا کہ جس میں تمہاری خوشی ہے، ہم تمہیں اسی کی طرف پھیر دیں گے اور پھر فرمایا کہ ابھی اپنا منہ مسجدِ حرام کی سمت پھیر لو (سورہ البقرہ) اپنے محبوب کی بات ماننے کا ذکر اس نے یوں بھی کیا کہ فرمایا، جب لوگ اپنی جانوں پر ظلم کر لیں یعنی ان سے کوئی قصور سرزد ہو جائے، تو وہ اے محبوب! آپ کے حضور حاضر ہوں، پھر اللہ سے معافی چاہیں، پھر رسول ان کی شفاعت فرما دیں تو وہ ضرور اللہ کو بہت توبہ قبول کرنے والا مہربان پائیں گے (سورۂ نساء)
آقا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زیدؓ بن حارثہ کے نکاح کا پیغام اپنی پھوپھی زاد

حضرت زینبؓ کے لیے دیا تو ان کے بھائی عبداللہ بن جحش نے اسے منظور کرنے میں اس لیے پس و پیش کیا کہ حضرت زیدؓ خاندانی طور پر اتنے عالی نہ تھے۔ اس پر خدا تعالیٰ نے حکم نازل فرما دیا کہ جب اللہ اور رسولؐ کچھ حکم فرما دیں تو پھر کسی مسلمان عورت یا مرد کو اپنے کسی معاملے میں بھی کچھ اختیار نہیں رہتا۔ (سورہ احزاب)

محبت کا ایک تقاضا یہ بھی ہوتا ہے کہ محب اپنے محبوب کی کوئی تکلیف برداشت نہیں کرتا چنانچہ جب حضورؐ نے ساری رات خدا کی عبادت کرنا شروع کی تو اللہ کو محبوب کی اس ادا میں ان کی تکلیف کا خیال ہوا اور فرمایا یٰاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ ﴿﴾ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا کہ اے کپڑوں میں لپٹنے والے، رات میں کچھ رات کے لیے قیام فرماؤ (سورۂ مزمل)

پھر محب کے لیے ضروری ہے کہ وہ محبوب کی رضا چاہے، اُس کی خوشی میں اپنی خوشی سمجھے، چنانچہ اللہ کریم نے فرمایا وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى (سورۃ الضحیٰ) (بیشک قریب ہے کہ تمہارا رب تمہیں اتنا دے گا کہ راضی ہو جاؤ گے)

یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ محب اپنے محبوب کے عزیزوں اور اُس کے نام لیواؤں کو اچھا سمجھتا ہے، جن لوگوں سے اس کی نسبت ہوتی ہے، وہ محب کو اچھے لگتے ہیں۔ اسی حوالے سے اس فرمانِ خداوندی کو دیکھیے کہ "اے محبوب! فرما دیجیے کہ اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میرے فرمانبردار بنو، اللہ تمہیں دوست بنا لے گا، تم سے محبت کرنے لگے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے" (سورہ آلِ عمران) یعنی جو اُس کے محبوب کی بات مانیں گے، ان کی اتباع کریں گے، ان کی فرمانبرداری کریں گے، اللہ ان سے محبت کرنے لگے گا۔ اسی لیے خدا تعالیٰ نے اپنے محبوب کی اطاعت کو اپنی اطاعت فرمایا (سورہ النساء) اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بندوں میں سے جس کسی سے ——— کوئی غلطی سرزد ہو جائے اُسے اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہونے کو کہا ہے (سورۂ زمر) اور اپنے محبوب پاکؐ کے ساتھیوں کو اللہ نے کافروں پر سخت اور آپس میں نرم دل قرار دیا۔ (سورۃ الفتح)

یہ بھی ہوتا ہے کہ اپنے محبوب سے محبت کرنے والا دوسروں کو یقین دلاتا ہے کہ اُس کا محبوب سب سے اچھا ہے۔ اسی لیے خدا تعالیٰ نے سب پیغمبروں سے عہد و پیمان لیا کہ جب اُن کے پاس اللہ کا محبوب رسولؐ آئے گا تو وہ ضرور اس پر ایمان لائیں گے اور اس کی مدد کریں گے (سورۂ آلِ عمران) یہ سرکار صلے اللہ علیہ وسلم کی عظمت کو سب رسولوں سے تسلیم کروانے کا عمل تھا۔ اسی طرح جب اللہ یہ فرماتا ہے کہ جو کنکریوں کی مٹھی حضورؐ نے جنگِ بدر کے موقع پر دشمنوں کی طرف پھینکی تھی، وہ حضورؐ نے نہیں بلکہ خود اللہ نے پھینکی تھی (سورہ انفال) تو مقصد یہ ہے کہ سب لوگ مان لیں کہ حضورؐ کے مرتبے کو کوئی نہیں پہنچ سکتا اور اسی سورہ میں اللہ کا یہ فرمان کہ اے محبوبؐ جب تک تم ان میں ہو، اللہ کا کام نہیں کہ انہیں عذاب میں مبتلا کرے (سورۂ انفال) سرکارؐ کی کتنی بڑائی ظاہر کرتا ہے۔ دوسرے پیغمبروں کی حیات ظاہری میں بھی ان کی قومیں عذابِ الٰہی کا شکار ہوئیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ فرما کر کہ جب تک یہ ہم میں ہیں، ہم عذاب میں مبتلا نہیں ہوں گے، خداوندِ کریم نے دُنیا پر ظاہر کر دیا کہ اس کے محبوب پاکؐ سے عظیم المرتبت کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔

محبت کے تقاضوں میں سے اہم ترین تقاضا یہ ہے کہ محب اپنے محبوب کی توہین برداشت نہیں کر سکتا اور خدا تعالیٰ نے بھی یہی کیا ہے۔ جو لوگ یہ کہتے تھے کہ حضورؐ تو کھانا کھاتے ہیں اور بازاروں میں چلتے ہیں اور یہ کہ کوئی فرشتہ اُتارا جانا چاہیے تھا، انہیں اللہ نے گمراہ فرمایا ——— اور گمراہ بھی ایسے کہ اب راہ نہیں پا سکتے (سورۂ فرقان) یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اہانت کفر ہے اور کفر بھی ایسا کہ اس دلدل میں دھنسنے والے چھٹکارا نہیں پا سکتے، ان کے لیے ایمان کی روشنی کا حصول ممکن ہی نہیں۔

جب منافقین نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو "راعنا" کے بجائے ذرا سا لہجہ بگاڑ کر یہ لفظ کہا جس سے وہ بزعم خود حضورؐ کی تضحیک کا پہلو نکال لیتے تھے (نعوذ باللہ) تو اللہ نے حکماً اس لفظ کا استعمال ہی ممنوع فرما دیا اور حکم دے دیا کہ جب آقاؐ کی

توجہ مطلوب ہو، اُنظُرنَا یا رَسُولَ اللّٰہ کہو کر یا رسول اللہ! ہماری طرف نظرِ کرم فرمائیے (سُورۃ البقرہ) اس طرح ہر ایسا لفظ بھی آقا کے لیے استعمال کرنا ممنوع قرار پایا جس کا معنی کھینچ تان کر بھی ایسا نکلتا ہو جو حضورؐ کے مرتبے سے فروتر ہو۔ پھر فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پکارنے کو آپس میں ایسا نہ ٹھہرالو جیسا تم ایک دوسرے کو پکارتے ہو (سُورۃ نُور) پھر ارشاد ہوا کہ اپنی آوازیں اپنے آقا کی آواز سے اُونچی نہ کرو اور ان کے حضور چلا کر بات نہ کہو جیسا تم ایک دوسرے کے سامنے کرتے ہو کہ کہیں تمہارے اعمال برباد نہ ہو جائیں اور تمہیں خبر بھی نہ ہو (سُورہ الحجرات) یعنی بارگاہِ مصطفوی میں اُونچی آواز سے بولنا، چلا کر بات کرنا، سرکارؐ کو اس طرح پکارنا جس طرح کوئی ایک آدمی دوسرے کو پکار سکتا ہے یا کوئی ایسا لفظ استعمال کرنا جس کے دُور کے معنی بھی ایسے نکل سکتے ہوں جو مقامِ مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے کمتر ہوں، منع ہے۔ اللہ کو اپنے محبوبؐ کی توہین اشارتاً بھی گوارا نہیں۔

اور ــــــ محبت کا سب سے بڑا تقاضا یہی ہے کہ جہاں محب کو محسوس ہو کہ اس کے محبوب کی توہین کی گئی ہے یا اسے نقصان پہنچانے کی کوشش ہوئی ہے یا اسے تکلیف پہنچائی گئی ہے، وہاں اس کا غضب جوش میں آجائے، وہ محبوب کے دُشمنوں کے خلاف اُٹھ کھڑا ہو ــــ اس پہلو سے خالقِ حقیقی اور اس کے محبوبِ حقیقی کے باہمی ربطِ محبت پر نظر دوڑائیں تو واضح ہوتا ہے کہ نہ ایسا محب کبھی ہُوا ہے، نہ ایسا محبوبؐ کسی نے دیکھا ہے۔ جب عاص بن وائل نے حضورؐ کے بارے میں (نعوذ باللہ) "ابتر" کا لفظ استعمال کیا تو اللہ نے سورۃ کوثر نازل فرما دی۔ جس میں حضورؐ کو خیرِ کثیر عطا فرمانے کا ذکر کیا اور فرمایا کہ "ابتر" تو آپ کا دُشمن ہے۔ (سُورۃ کوثر) ابُولہب نے حضور حبیبِ کبریا علیہ التحیۃ والثنا کی شان میں گستاخی کی تو اللہ نے سُورۃ لہب نازل فرما دی جس میں اس کے دونوں ہاتھ ٹوٹنے کا کوسنا دیا اور اس کی مکمل تباہی کا اعلان فرمایا۔ اسے اور اس کی بیوی اُمِ جمیل کے جو ابوسفیان کی بہن تھی، آگ میں دھنسنے کے انجام کا ذکر کیا اور اُمِ جمیل کے گلے میں کھجور کی چھال

کے رستے کی بات کی (اور وہ اسی طرح مری کہ سر پر گٹھا لا رہی تھی، راستے میں سستانے کے لیے بیٹھی، گٹھا پیچھے کو کھینچا اور رسّی سے گلے میں پھانسی پڑ گئی)

خداوندِ کریم نے اُس عورت کے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی راہ میں کانٹے بچھایا کرتی تھی، رستے کی پھانسی سے مرنے کی پیشگوئی کی اور وہ اسی طرح مری۔ اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ محبوبؐ کی توہین و تضحیک کا ارتکاب کرنے کا جو انجام ہونا چاہیئے اُس کا اعلان کیا گیا اور وہ اسی طرح ہُوا۔ اس طرح خدا تعالیٰ نے یہ بھی ظاہر فرما دیا کہ جو آدمی اس کے محبوب صلے اللہ علیہ وسلم کو تکلیف دے، ان کا مضحکہ اُڑانے کی کوشش کرے یا ان کی توہین کرے، اس کا انجام یہی ہونا چاہیئے۔ سُورہ لہب کی اس پیشگوئی کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ حضورؐ کی سچائی کو دنیا پر ثابت کر دیا جائے اور اللہ کی اپنے محبوبؐ سے انتہائے محبت بھی کائناتِ عالم پر واضح ہو جائے اور محبت کا یہ اُصول بھی بیان ہو جائے کہ محبوبؐ کے دُشمنوں، اُس کے نہ ماننے والوں اور اس کی اہانت کرنے والوں کے خلاف محب کا اقدام کیا ہونا چاہیئے۔

اسی طرح جب ولید بن مغیرہ نے خالق و مالکِ ہر عالم جلّ و علا کے محبوبؐ کی توہین کی، (نعوذ باللہ انہیں مجنون کہا) تو اللہ تعالےٰ نے سُورہ نٓ (والقلم) نازل فرمائی۔ جس میں پہلے تو قلم اور اس کے لکھے کی قسم کھا کر فرمایا، مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ کہ آپ تو اپنے رب کے فضل سے مجنون نہیں ہیں۔ پھر اُس بدبخت کی دس بُرائیاں گنوائیں کہ وہ بڑا قسمیں کھانے والا ہے، ذلیل ہے، بہت طعنے دینے والا ہے، بہت اِدھر کی اُدھر لگانے والا ہے، بھلائی سے بڑا روکنے والا ہے، حد سے بڑھنے والا گنہگار ہے، درشت خو ہے اور اس پر طرّہ یہ ہے کہ حرامزادہ ہے، اس کی اصل میں خطا ہے، وہ اپنے باپ کا نہیں۔ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِیْمٍ پھر فرمایا۔ سَنَسِمُهٗ عَلَى الْخُرْطُوْمِ کہ ہم اس کی سونڈ پر داغ دیں گے ــــــ اور یہ پیشگوئی یوں پُوری ہوئی کہ جنگِ بدر میں ولید بن مغیرہ کی ناک کٹ گئی اور پھر وہ جدھر سے جاتا تھا لوگ کہتے تھے کہ یہ وہ ہے جس کے متعلق اللہ نے کہا تھا کہ اس کی ناک داغی جائے گی

اور وہ نشان سامنے ہے چنانچہ وہ جو اس کے زنا کی اولاد ہونے کی خبر تھی، وہ بھی لازماً درست ہوگی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ نے کسی کے اپنے باپ کا بیٹا نہ ہونے کی جو بات قیامت تک چھپائے رکھنے کا اہتمام کر رکھا ہے کہ وہاں بھی لوگ اپنی ماؤں کے نام سے پکارے جائیں گے ـــــ اپنے محبوب کی توہین کے جواب میں استثنائی صورت میں ولید بن مغیرہ کے حرامی ہونے کو نہ چھپایا، بلکہ اس کا اعلان بھی کیا اور اس کے ناک پر نشان لگانے کی پیشگوئی درست کر کے لوگوں پر واضح بھی کر دیا کہ اگر "سنسمہ علی الخرطوم" کی بات درست نکلی ہے تو اس کے والد الزنا ہونے کی بات بھی درست ہی ہے۔ یعنی نہ صرف اللہ تعالیٰ نے اُس کے اپنی اصل پر نہ ہونے کا اعلان کیا، بلکہ ثابت بھی کر دیا کہ وہ بے اصل ہے۔

اب صورت یہ ہے کہ حضور محبوبِ خالق و مطلوبِ خلائق (صلے اللہ علیہ وسلم) اپنے خالق کے بھی محبوب ہیں اور مسلمانوں کے لیے بھی اُن کی محبت اصل ایمان ہے۔ اور خالقِ حقیقی جل جلالہٗ وعم نوالہٗ اپنے محبوبِ پاکؐ کی تعریف بھی کرتا ہے انہیں نام کے بجائے پیار کے القابات و خطابات سے پکارتا ہے، ان کی بات مانتا ہے اور لوگوں سے اُن کا حکم منوانا چاہتا ہے، ان کی تکلیف کو برداشت نہیں کرتا، ان کی رضا چاہتا ہے، ان کے دوستوں اور نام لیواؤں کو اچھا سمجھتا ہے، دوسروں کو یقین دلاتا ہے کہ اس کے محبوبِ پاک سب سے اچھے ہیں، برداشت نہیں کرتا کہ کوئی حضورؐ کی توہین کرے اور اگر کسی نے اس حرکت کا ارتکاب کیا تو اللہ نے اُس کے خلاف کہا بھی اور کیا بھی۔

اللہ کی اس سُنت پر صحابہ کرامؓ نے پوری طرح عمل کیا اور محبت کے سب تقاضوں کو نبھایا۔ مثلاً عاص بن ہشام بن مغیرہ حضرت فاروقِ اعظمؓ کا سگا ماموں تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کرتا تھا۔ فارقِ حق و باطلؓ نے جنگِ بدر میں اُس کے ایسی تلوار ماری کہ اس کے سر کو کاٹتی ہوئی جبڑے تک اُتر گئی۔ اس طرح صحابیٔ رسولؐ نے محبتِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا حق ادا کیا۔ اسی غزوے میں حضرت ابو حذیفہؓ

اپنے کافر باپ عتبہ بن ربیعہ کے مقابلے کے لیے نکلے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں باپ کے مقابلے میں جانے کی اجازت نہ دی اور عتبہ حضرت حمزہؓ کی تلوار سے قتل ہُوا (سیرت ابن ہشام)، ام المومنین حضرت ام حبیبہؓ کے والد ابُوسفیان صلح حدیبیہ کے زمانے میں مدینہ آئے، اپنی بیٹی سے ملنے گئے اور بستر پر بیٹھنے لگے تو حضرت ام حبیبہؓ نے بستر اُلٹ دیا اور فرمایا کہ یہ اللہ کے حبیبؐ کا پاک بستر ہے اور تم مشرک ہونے کی وجہ سے ناپاک ہو" اس لیے تم اس بستر پر نہیں بیٹھ سکتے۔ (صحابہ کا عشقِ رسولؐ از صُوفی محمد اکرم رضوی)

حضرت عبدُاللہ ابنِ عباسؓ سے روایت ہے کہ ایک نابینا کی بیوی جس سے اس کے دو بیٹے بھی تھے، حضور علیہ التحیۃ والصلوٰۃ والسلام کی شان میں گستاخی کیا کرتی تھی۔ وہ نابینا منع کرتا تھا، مگر وہ باز نہ آتی تھی۔ آخر ایک دن اس نے چھرا اُس کے پیٹ میں بھونک کر اسے ہلاک کر دیا۔ آقا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں معاملہ پیش ہُوا۔ نابینا نے ساری بات سُنائی تو حضورؐ نے فیصلہ فرمایا کہ اس عورت کا خون رائیگاں ہے یعنی قصاص وغیرہ کچھ نہیں لیا جائے گا (سنن ابو داؤد، کتاب الحدود)

آقا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فیصلے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ جو شخص حضور رسول کریم علیہ التحیۃ والصلوٰۃ والتسلیم کی توہین کا مرتکب ہو، اس کا خون اسلام میں جائز ہے اور اس کا کوئی قصاص نہیں۔

کعب ابنِ زہیر نے حالتِ کُفر میں حضورؐ کی ہجو کہی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے قتل کا حکم دے دیا۔ پھر وہ دربارِ مصطفویؐ میں حاضر ہو گئے اور اپنا مشہور قصیدہ "بانت سعاد" پیش کیا جس پر حضورؐ نے انہیں معاف فرما دیا۔ قصیدے کے تین شعر دیکھیے:

نبئت ان رسول اللہ اوعدنی
والعفو عند رسول اللہ مأمول
فقد اتیت رسول اللہ معتذراً
والعذر عند رسول اللہ مقبول

ان الرسول لنور یستضاء بہ

مھند من سیوف اللّٰہ مسلول (سیرت ابن ہشام)

یعنی مجھے معلوم ہُوا کہ رسولِ خدا نے میرے قتل کی وعید فرمائی ہے اور رسُولِ خدا کے یہاں عفوو درگزر کی بھی اُمید ہے۔ تو میں رسُولِ خدا کے یہاں معذرت کیساتھ حاضر ہوگیا ہوں اور معذرت رسولؐ اللہ کی بارگاہ میں مقبول ہے۔ بے شک رسُولؐ ایسے نور ہیں جس سے روشنی حاصل کی جاتی ہے اور وہ خدا کی تلواروں میں سے ایک بے نیام تلوار ہیں (آخری شعر کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ حضور سرکارِ دوعالم صلے اللہ علیہ وسلم نے اس شعر میں اصلاح فرمائی)

قرآن پاک میں خداوندِ دوجہاں کے فرمودات اور احادیث پاک میں حضور پیغمبر اسلام علیہ السّلام کے ارشادات سے اور صحابۂ کرامؓ (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کے عمل سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ وہ شخص جسے ایمان کا دعوٰی ہے۔ اس کے لیے حضور علیہ التحیۃ والتسلیم کی محبت نہ صرف ضروری ہے بلکہ سب محبتوں سے بڑھ کر ضروری ہے اور اس محبت کے تقاضے یہ ہیں کہ آقا حضورؐ کی ہر صبح و مسا تعریف کی جائے، ان کا حکم مانا جائے، ان کی رضا جوئی میں زندگی گزاری جائے، ان کے دوستوں اور ماننے والوں اور ان سے محبت کرنے والوں کو اچھا سمجھا جائے اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ جہاں ناموسِ مصطفےٰ (علیہ التحیۃ والثنا) کی حفاظت کا مسئلہ آن پڑے، جہاں کوئی نخرِ نا مشخص ان کی توہین و تضحیک کا ارتکاب کر بیٹھے، جہاں ان کی مخالفت کا شائبہ بھی نظر آجائے، وہاں حمیتِ دینی اور تقاضائے محبت کے باعث مومن اپنی جان کی بازی لگا دے اور حضورؐ کی شان میں ذراسی گستاخی کرنے والے کا قلع قمع کردے۔ ناموسِ مصطفےٰؐ کی حفاظت کے لیے جانثاری اور جاں سپاری کے واقعات تاریخ کے صفحات میں موجود ہیں۔ کسی بھی دور میں کسی بدبخت نے اہانتِ رسُولؐ کا جرم کیا، اسے سزا دینے کے لیے کوئی نہ کوئی مومن اُٹھ کھڑا ہُوا۔

ذکرِ سرکار صلی اللہ علیہ وسلم

ایک خطاب

خداوندِ تبارک وتعالیٰ نے زمین، آسمان، سُورج، چاند، ستارے ـــــ بہت سی دنیائیں پیدا کیں، ان میں قسم قسم کی مخلُوق تخلیق کی جب کچھ بھی نہ تھا، خدا نے چاہا کہ یہ سب کچھ پیدا ہو جائے، ہوگیا۔ کُن اور فیکُون کے درمیان کوئی فاصلہ نہ تھا، مگر "کیوں" کا سوال اپنی جگہ ہے۔ یہ ہنگامۂ عالم کس سبب سے ہُوا؟ اس کی تخلیق کا باعث کیا تھا، یہ سب کچھ کیوں بنایا گیا ـــــ تو خدا نے اسے بھی راز نہیں رکھا۔ ہر عالم کی تخلیق کا سبب اور زمین و آسمان کی تشکیل کا باعث بھی اس نے بتا دیا۔ لَوْلَاکَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاکَ، اُس نے اپنے محبوب پاک صاحبِ لولاک صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ یہ سب کچھ آپ کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔

پھر اس نے اپنے پیارے، حضور سرورِ کائنات علیہ التحیۃ والصلوٰۃ کے ذکرِ مبارک کو بلند کرنے کا اعلان فرمایا تو وہ بھی اِن الفاظ میں کہ وَرَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ۔ ہم نے آپ کا ذکر، آپ کی خاطر بلند کر دیا۔ وَرَفَعْنَا، ہم نے رفعت دی، ہم نے بلندی بخشی۔ "لَکَ" آپ کی خاطر۔ ذِکْرَکَ، آپ کے ذکر کو۔ ہم نے آپ کے ذکر کو آپ کی خاطر بلند کر دیا، ہم نے آپ کے ذکر کو، آپ کو خوش کرنے کے لیے رفعت دی، بلندی بخشی۔

یعنی خدائے بزرگ و برتر کائناتِ عالم کو بناتا ہے، سرکارؐ کی خاطر تو پھر اس نے تمام دنیاؤں میں جو جو کچھ پیدا کیا، وہ ایک خاص مقصد کے لیے کیا نا؟ ہم دوسری دنیاؤں کو تو نہ دیکھ سکتے ہیں، نہ ان کے بارے میں ابھی تک زیادہ جان سکے ہیں، اپنی دُنیا کی بات کریں تو سائنس دانوں کی ہزار ہا برسوں کی تلاش و تحقیق کا نتیجہ یہ ہے کہ دُنیا کی تخلیق سے پہلے فضا میں دھواں ہی دھواں تھا۔ پھر اس دھوئیں میں حرکت پیدا ہوئی۔

لاتعداد چکر چلنے لگے اور کروڑوں ستارے معرضِ وجود میں آ گئے۔ ان میں زمین بھی شامل تھی، پہلے سخت گرم تھی، ڈھیلی اور پھیلی ہوئی۔ بعد میں ٹھنڈی ہو کر سکڑنے لگی اور آج تک سکڑ رہی ہے۔ سائنس دان تو اب اس نتیجے پر پہنچے ہیں، علام الغیوب نے چودہ سو برس پہلے یہ حقیقت اپنے محبوب پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے دُنیا تک پہنچا دی تھی۔ سورہ رعد میں ارشادِ خداوندی ہے اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا نَاْتِی الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا۔ کیا وہ دیکھتے نہیں کہ ہم زمین کو سکیڑتے اور اس کے حجم کو گھٹاتے جا رہے ہیں —— اور حضرات! یہ سکڑتی ہوئی زمین لاکھوں قسم کے حیوانات، جمادات، نباتات کے ساتھ آباد ہے اور ہر قسم کے خزانوں اور طرح طرح کی مخلوق کے ساتھ آباد زمین کو پیدا کرنے کا مقصد صرف محبوبِ خدا علیہ التحیۃ والثنا کی خوشنودی ہے۔

یہ زمین، چاند سورج، جسے ہم کل کائنات سمجھتے ہیں، یہ تو کائنات کے محیط میں ایک ذرے کے برابر ہے۔ اندازہ فرمایئے کہ ہماری زمین کا قطر بارہ ہزار کچھ کلومیٹر ہے جبکہ سائنس دانوں کی تحقیق کے مطابق ایک سیارہ جیوپیٹر کا قطر کوئی ڈیڑھ لاکھ کلومیٹر ہے اور ہمارے سورج کا قطر ۱۴ لاکھ کلومیٹر ہے یعنی زمین سے کوئی ۱۰۹ گنا بڑا۔ یہ جو کہکشاں ہمیں رات کو نظر آتی ہے، اس میں سَو ارب ستارے پائے جاتے ہیں۔ اور یہ کہکشاں ہم سے کتنی دور ہے، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ روشنی یعنی یہ ظہوری نور ایک سیکنڈ میں تین لاکھ کلومیٹر کا سفر طے کرتا ہے۔ اس طرح ایک سال میں اس کا سفر ۹۵ کھرب کلومیٹر بنتا ہے۔ ۹۵ کھرب کلومیٹر کے فاصلے کو ایک نوری سال کا فاصلہ کہا جاتا ہے اور کہکشاں کا وہ حصہ بھی انسان دریافت کر چکا ہے، جس کی روشنی ہم تک دس ارب نوری سال میں پہنچتی ہے۔ اب کائنات کی ان وسعتوں کا اندازہ کیجئے اور پھر اس ہستی کی عظمت کا احساس کیجئے جس کی خاطر یہ سب کچھ پیدا کیا گیا۔

زمین کی بے شمار مخلوق میں سے ایک کو انسان کہتے ہیں۔ حضرات! انسانی

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ۔ سرکارؐ میرے اور آپ کے لیے بھی رحمت ہیں۔ وہ اس دُنیا کے لیے اور اس میں رہنے والی ہر ذی رُوح اور غیر ذی رُوح مخلوق کے لیے رحمت ہیں۔ دریاؤں کے چلنے میں بھی رحمت ہے، سورج کی گرمی میں اور چاند ستاروں کی چمک اور روشنی میں بھی رحمت ہے۔ رحمۃٌ للعالمین اس قوت کا نام ہے جس کے لیے یہ سب کچھ بنایا گیا اور جو اس سب کچھ کو ایک نظام کے ساتھ چلاتی ہے۔ رحمۃٌ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت راہ میں حائل نہ ہو تو سورج کی گرمی ہمیں جلا کر بھسم کر دے۔ رحمۃ للعالمینؐ کی قوت ہماری مددگار نہ ہو تو ہم دریاؤں کے بہاؤ کا شکار ہو جائیں۔ رحمۃٌ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت اگر نظم و ضبط کی نگران نہ ہوتی تو پورا نظامِ شمسی دھڑام سے گر پڑتا۔ کوئی ایک ستارہ کسی دوسرے ستارے سے ٹکرا جاتا —— ہر چیز اپنے مدار میں نہ گھوم رہی ہوتی۔ حضراتِ مکرم! یہ سارا فیضِ محبوبِ ربِ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کا ہے۔ میں اور آپ ایک بہت بڑے نظام کے کل پُرزے ہیں۔ یہ سارا نظام خالق و مالکِ حقیقی جل شانہ نے ایک خاص مقصد کے لیے بنایا اور وہ مقصد چھپا کر نہیں رکھا، کھول کر بیان کر دیا۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی خاطر یہ سب کچھ بنایا گیا۔ حضورؐ ہی کا فیضان ہے کہ یہ سب کچھ بن گیا اور حضرات! جو فیض یاب ہوتا ہے، وہ تعریف کرتا ہے۔ جس کا فیض جاری نہ ہو، اس کی تعریف جاری نہیں ہوتی۔ جو فیض یاب نہ ہو، وہ تعریف نہیں کرتا۔ تمام دنیاؤں اور ان کی ہر چیز پر حضور سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا فیضان نہ ہوتا تو ہر چیز ان کی تعریف میں رطب اللسان نہ ہوتی۔ خدا کے قول کے مطابق ہر عالم کا ہر ذرہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض کا احسان مند ہے، اس لیے ہر عالم کا ذرہ ذرہ ان کی تعریف میں مشغول ہے۔

دیکھیے نا۔ آقا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اسمِ گرامی "محمد" ہے، بہت زیادہ تعریف کیے گئے۔ لیکن خدا کا حکم تو یہ ہے کہ "الحمدللہ" سب تعریفیں اللہ کو سزاوار ہیں، اللہ کے سوا کوئی تعریف کے لائق نہیں۔ تو قبلہ جس کے سوا کسی کی تعریف نہ کی جا سکتی ہو، جس کی وہ تعریف کرتا ہے، اسے "محمدؐ" کیوں نہ کہے۔ اور وہ حضورؐ کی تعریف کرتا ہے تو کسی

جسم چھوٹے چھوٹے خلیات (cell) سے مل کر بنتا ہے۔ ایک انسان میں ایک کروڑ ارب کے قریب خلیے ہوتے ہیں، روزانہ کروڑوں خلیے ختم ہوتے رہتے ہیں اور نئے خلیے اُسی وقت ان کی جگہ لے لیتے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق ہمارے دماغ میں سوا لاکھ خلیے ہوتے ہیں اور ہر خلیہ ایک کروڑ سے لے کر دس کروڑ تک معلومات اور جذبے ریکارڈ کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ بعض صورتوں میں اس سے بھی زیادہ۔ مثلاً محبت کا خلیہ بیک وقت ایک کروڑ سے دس کروڑ انسانوں، جانداروں اور چیزوں کی محبت کو اپنے اندر سمو سکتا ہے۔ دماغ کے سوا لاکھ خلیے کم از کم دس کھرب معلومات ریکارڈ کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔

حضراتِ مکرم! خلیوں کے نظام کو سمجھنا شاید مشکل ہو۔ ایک عام فہم مثال دیکھیے کہ انسان میں دو گُردے ہوتے ہیں۔ ایک وقت میں ایک گُردہ کام کرتا ہے، دُوسرا آرام کرتا ہے۔ جونہی ایک گُردہ کام کرنا چھوڑتا ہے، دوسرا کام کرنے لگتا ہے۔ کسی بیماری کی وجہ سے کسی شخص کا ایک گُردہ نکال دیا جائے تو جو واحد گُردہ رہ جاتا ہے، وہ ہر وقت کام کرنا شروع کر دیتا ہے۔ پھر انسان کا دل جو وزن میں آدھے پونڈ سے زیادہ نہیں ہوتا، اُس میں دو پمپ ہوتے ہیں۔ ایک پھیپھڑوں کو خُون بھیجتا ہے تاکہ وہاں سے آکسیجن لے سکے۔ دوسرا صاف شُدہ خُون کو سارے بدن میں دوڑاتا ہے۔ ایک آدمی کی اوسط زندگی میں دل ۳ لاکھ ٹن خون پمپ کرتا ہے۔ انسان کی اوسط زندگی میں اس کے پھیپھڑے کوئی پچاس کروڑ مرتبہ پھولتے اور سکڑتے ہیں۔ یہ خدا تعالےٰ کی پیدا کردہ اربوں، کھربوں دنیاؤں میں موجود اربوں کھربوں قسم کی مخلوق میں سے ایک قسم کی مخلوق کے لاکھوں کروڑوں میں سے ایک آدھ پہلو کی بات ہے۔ ہر مخلوق کو اللہ تعالےٰ نے عجیب و غریب، الگ الگ، پیچیدہ نظام کے تحت پیدا کیا ہے اور چلا رہا ہے ——— اور اس سب کچھ کا مقصد صرف یہ ہے کہ وہ اپنے محبوب کو خوش کرے۔

پھر آقا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اُس نے عالمین کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے،

اور مقصد کے لیے نہیں، محض انہیں خوش کرنے کے لیے۔ ورفعنا لک ذکرک۔ سرکارؐ کے ذکر کو اُن کی خاطر بلند کرنے کا اعلان کیا گیا ہے۔ اُس نے حضورؐ کے ہاتھ کو اپنا ہاتھ قرار دیا۔ یُبَایِعُوْنَکَ یُبَایِعُوْنَ اللّٰہَ۔ یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْہِمْ۔ تو اس کا مقصد حضورؐ کو خوش کرنا ہے۔ جب اُس نے مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ کہا تو معنی یہ ہے کہ حضورؐ کی خاطر اعلان کیا جا رہا ہے کہ ان کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے۔ جب کہا: وَلَوْ اَنَّہُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَہُمْ جَآءُوْکَ، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خاطر یہ حُکم جاری کیا کہ مسلمانوں میں سے جو شخص اپنی جان پر ظُلم کر بیٹھے، اس سے کوئی غلطی سرزد ہو جائے، وہ حضورؐ کے دربارِ گہر بار میں حاضر ہو۔ اس طرح حضورؐ خوش ہوں گے اور اس کی سفارش کریں گے، اور وہ اللہ اس کی توبہ قبول کرے گا ——— یہ سب کچھ اللہ نے حضورؐ کی خاطر کیا۔

اسی لیے اس نے اہلِ ایمان کو حُکم دیا ہے کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہِ بیکس پناہ میں درود و سلام کے گجرے پیش کریں۔ لیکن اس سے پہلے اس عظیم کام کی اہمیت بیان فرما دی کہ صرف یہی نہیں کہ تمہیں یہ کام کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ صورت یہ ہے کہ اللہ اور فرشتے پہلے سے اُن پر درود بھیجتے ہیں۔ اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ یٰٓاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا۔ بے شک اللہ اور اس کے فرشتے نبی کریم حضور رسولِ انام علیہ الصلوٰۃ والسلام پر درود بھیجتے ہیں۔ مومنو! تم بھی ان پر درود بھیجو اور خوب سلام۔ اعلان یہ ہے کہ اللہ خود خالق و مالک خود، اور اس کے سب ملائکہ حضورؐ پر درود بھیجتے ہیں اور حُکم یہ ہے مومنوں کے لیے کہ تم بھی ان پہ درود اور سلام بھیجو۔ اللہ نے اپنے اور فرشتوں کے لیے تو کہا کہ وہ درود بھیجتے ہیں، مسلمانوں کے لیے حُکم دیا کہ وہ درود بھی بھیجیں اور سلام بھی۔ یعنی مسلمانوں کو درود ہی بھیجنے کا حُکم نہیں، سلام پیش کرنے کا ارشاد بھی ہے۔ پھر درود کے بارے میں یہ ہدایت یہ تاکید نہیں لیکن سلام کے بارے میں ہے کہ "سَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا": سلام بھیجو، خوب۔ سلام بھیجو اس طرح جس طرح سلام بھیجنے کا حق ہے۔ یہ کام زیادہ اہتمام سے کرنا۔

اللہ تعالےٰ کے اس حکم کے بارے میں مزید توضیحی ہدایات آقا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جاری فرمائیں۔ ترمذی شریف میں حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے روایت ہے۔ سرکارؐ نے فرمایا، قیامت کے دن لوگوں میں سب سے زیادہ میرے نزدیک وہ شخص ہوگا جو مجھ پر اکثر درود پڑھنے والا ہے۔ ترمذی ہی میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اس شخص کی ناک خاک آلود ہو جس کے سامنے میرا ذکر کیا جائے اور وہ درود نہ پڑھے۔ حضرات! اگر حضورؐ کا فرمان بجا ہے! اس کا لفظ لفظ سچا ہے تو پھر ہم جب بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی سنیں یا پڑھیں، سرتاپا درود کیوں نہ بن جایا کریں۔ پھر یہ کیسے ہوتا ہے کہ ہم محبت سے ان کا ذکر کرتے بھی ہیں اور سُنتے بھی ہیں، ان سے محبت کے دعویدار بھی ہیں لیکن درود پڑھنے میں کنجوسی کرتے ہیں ——

ترمذی شریف کی ایک اور روایت دیکھیے۔ حضرت اُبی ابن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آقا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیک وسلم) میں آپ پر کتنا درود پڑھا کروں۔ فرمایا، جتنا چاہو۔ عرض کیا، اوراد و اعمال کے سارے وقت کا ایک چوتھائی پڑھوں۔ فرمایا، جتنا چاہو، لیکن درود زیادہ کرو تو بہتر ہے۔ عرض کیا، آدھا؟ فرمایا، جتنا چاہو، مگر درود زیادہ کرو تو بہتر ہے۔ عرض کیا، دو تہائی؟ فرمایا، جتنا چاہو، مگر درود اور زیادہ کرو تو بہتر ہے۔ عرض کیا، یا رسول اللہ! سارا وقت درود شریف ہی نہ پڑھا کروں؟ فرمایا۔ اِذًا یُکْفٰی ھَمُّکَ وَیُکَفَّرُ لَکَ ذَنْبُکَ۔ ... یعنی یہ درود تیرے سارے رنج و غم کو کافی ہے اور تیرے گناہوں کو مٹا دے گا۔

حضرات! میں درود پاک کی اہمیت عرض کر رہا ہوں۔ یہاں سے آپ میری گزارش سُن کر واپس جائیں اور اس پر عمل نہ کریں تو یہ المیہ ہوگا۔ لیکن یہ بھی غور کیجیے کہ یہ راجا رشید محمود جیسا عامی ہو یا کوئی جید عالم، آپ کو خدا اور رسول (جل و علا و صلی اللہ علیہ وسلم) کا کوئی حکم سُنا جائے اور خود اس پر عامل نہ ہو تو کتنا بُرا ہے۔ اس نقطۂ نظر

سے بھی اپنی آنکھیں کھلی رکھا کریں کہ سرکارؐ کے نام درود پڑھنے کے لیے راجا رشید محمود صرف آپ ہی کو کہتا ہے یا خود بھی ایسا کرتا ہے۔

بخاری شریف میں ہے سرکارِ والا تبار صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انہیں وہ درودِ پاک زیادہ پسند ہے جس میں سرکارؐ کے اب وجد کا اور ان کی آلِ اطہار کا ذکر ہے، جسے ہم درودِ ابراہیمی کہتے ہیں۔ حضرات! حضور سرورِ کائنات علیہ السلام والصلوٰۃ کی پسند کا تو یہ اثر ہے کہ اللہ کریم نے یہ درودِ ابراہیمی نماز کے لیے ضروری کر دیا کہ ہر نماز میں تشہد کے دوران اگر ہم یہ نہیں پڑھتے تو ہماری نماز ہی نہیں ہوتی۔ مگر ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جب ہم اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ کہتے ہیں تو مطلب ہے، اے اللہ! حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیج اور خدا ہمیں پہلے ہی کہہ چکا ہے کہ میں اور میرے فرشتے تو یہ کام کرتے ہی ہیں۔ پھر اگر ہم ہر وقت یہی کہتے رہیں کہ یا اللہ! تو ہی درود بھیج تو خدا یہ بھی تو کہہ سکتا ہے کہ میں نے تمہاری ڈیوٹی لگائی ہے اور یہ بتا کر لگائی ہے کہ میں تو درود بھیجتا ہی ہوں، تم بھی بھیجو اور پھر سلام بھی بھیجو اور سلام بھی یوں بھیجو جس طرح سلام بھیجنے کا حق ہے —— مگر تم پھر مجھی کو درود بھیجنے کے لیے کہہ رہے ہو۔ تو حضرات! اگر ہم اَلصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیْکَ یَارَسُوْلَ اللّٰہ" کہیں تو خدا کے حکم کی ٹھیک ٹھیک تعمیل ہوتی ہے۔ اس کا معنی ہے اے اللہ کے رسول! آپ پر درود اور سلام ہو۔ اس طرح ہم خود درود اور سلام بھیج کر اللہ کا حکم مان رہے ہیں۔ ہم اللہ کا حکم پوری طرح مان رہے ہیں۔

میں نے عرض کیا تھا کہ درودِ ابراہیمی کے بارے میں آقا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پسندیدگی کا اعلان فرمایا تو خداوندِ کریم نے اسے نماز میں شامل کر دیا کہ نماز اس کے بغیر مکمل ہی نہیں ہوتی۔ لیکن اس درود میں اللہ سے دُعا ہے کہ وہ سرکارؐ پر اور ان کی آل پر اسی طرح درود بھیجے اور برکتیں نازل کرے جیسا اس نے حضرت ابراہیمؑ اور ان کی آل پر نازل کی تھیں۔ یہ درودِ پاک اللہ تعالیٰ کے حکم کی پابندی کے ضمن میں نہیں آتا۔ شاید اسی لیے خداوندِ عزّوجل نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پسند کے درود

یعنی درودِ ابراہیمی کو تشہد میں پڑھنا ضروری فرماتے ہوئے اپنے حکم کی تعمیل کی ایک صُورت بھی ضروری قرار دے دی۔ ہمیں حکم دیا گیا کہ نماز میں بھی، التحیات میں بیٹھ کر، یہ درودِ ابراہیمی پڑھنے سے پہلے "اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ اَیُّھَا النَّبِیُّ" پڑھ لو۔ کہ یہ خوب خوب سلام بھیجنے کے حکم کی تعمیل بھی ہے اور خود بندے کی طرف سے براہِ راست پیش بھی کیا جا رہا ہے۔ یہ "سَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا" پر عمل کی ایک شکل ہے اور اس کے بغیر بھی نماز نہیں ہوتی ——— اور پھر اس کی ایک حکمت یہ بھی ہے کہ "التحیات" میں ہمیں اللہ کی وحدانیت اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت و عبدیت کی شہادت دینا ہوتی ہے۔ اس کے لیے بھی اللہ کا یہ نظام ہے کہ پہلے حضورؐ کی بارگاہ میں سلام پیش کرنے کی سعادت حاصل کرو۔ السلام علیک ایھا النبیؐ کہو۔ پھر اس کے بعد کلمۂ شہادت پڑھنے کے قابل ہو جاؤ گے۔

حضرات! اس صورتِ حال میں آپ علما سے نہ پوچھئے، خود غور کیجئے!

اپنے دِل سے پوچھ، مُلّا سے نہ پُوچھ

کہ خدا کا حکم کیا ہے اور اس پر عمل کرتے ہوئے "الصلوٰۃ والسلام علیک یارسُول اللہ" کہنے میں نعوذ باللہ کیا بُرائی ہے۔

(دارالعلوم خلیفیہ فریدیہ، بصیرپُور ضلع اوکاڑہ کے سالانہ اجلاس کے موقع پر کی گئی ایک تقریر)

نعت کے موضُوع پر مصنّف کا کام

مطبوعہ

ورفعنا لک ذکرک	(اُردو مجمُوعۂ نعت)	۱۹۷۷ء،
حدیثِ شوق	(اُردو مجمُوعۂ نعت)	۱۹۸۲ء
نعتاں دی اَڈّی	(پنجابی مجموعۂ نعت)	۱۹۸۵
حق دی تائید	(نعت و منقبت)	۱۹۵۶
مدحِ رسولؐ	(انتخابِ نعت)	۱۹۷۳
نعتِ خاتم المرسلینؐ	(انتخابِ نعت)	۱۹۸۲
نعتِ حافظ	(حافظ پیلی بھیتی کی نعتوں کا انتخاب)	۱۹۸۷
قلزمِ رحمت	(امیر مینائی کی نعتوں کا انتخاب)	۱۹۸۷

زیرِ طبع

اُردو نعت ——— تاریخ و تجزیہ

گنجینۂ نعت (غریب سہارنپوری کی نعتوں کا انتخاب)

قرآنِ جمال (حسن رضا بریلوی کی نعتوں کا انتخاب)

کلیّاتِ کافی (کفایت علی کافی شہید کا ذخیرۂ نعت)

اُردو کے چند نعت گو

فیضانِ رضا (انتخاب نعت)

ثنائے محمدؐ (انتخاب نعت)

ارمان مدینے والے دا (پنجابی نعتوں کا انتخاب)

دیگر موضوعات پر مصنف کی مطبوعات

تحریکِ ہجرت ۱۹۲۰ — ایک تاریخ، ایک تجزیہ	۱۹۸۲
اقبالؒ، قائدِ اعظمؒ اور پاکستان	۱۹۸۳
قائدِ اعظمؒ — افکار و کردار	۱۹۸۵
اقبال و احمد رضا، مدحت گرانِ پیغمبرؐ	۱۹۸۷، ۱۹۷۹، ۱۹۷۷
احادیث اور معاشرہ	۱۹۸۷، ۱۹۸۶
ماں باپ کے حقوق	۱۹۸۶
راج دلارے (بچوں کے لیے نظمیں)	۱۹۸۶، ۱۹۸۵
نظریۂ پاکستان اور نصابی کتب	۱۹۷۱
ترجمہ خصائص الکبریٰ (از امام جلال الدین سیوطیؒ)	۱۹۸۳
ترجمہ فتوح الغیب (از حضرت غوثِ اعظمؒ)	۱۹۸۲
ترجمہ تعبیر الرؤیا (منسوب بہ امام سیرینؒ)	۱۹۸۲
میرے سرکارؐ	۱۹۸۷

مصنف کی مطبوعہ تصانیف

نعت کے موضوع پر

- ورفعنا لک ذکرک (مجموعۂ نعت) ۱۹۷۷ ، ۱۹۸۷
- حدیثِ شوق 〃 ۱۹۸۲ ، ۱۹۸۶
- نعتاں دی ڈالی 〃 ۱۹۸۵
- حق دی تائید (نعت و منقبت) ۱۹۵۶
- مدحِ رسولؐ (انتخابِ نعت) ۱۹۷۳
- نعتِ خاتم المرسلینؐ 〃 ۱۹۸۲
- نعتِ حافظ (حافظ پیلی بھیتی کا انتخاب) ۱۹۸۶

دیگر موضوعات پر

- تحریکِ ہجرت ۱۹۲۰ — ایک تاریخ ایک تجزیہ ۱۹۸۶
- احادیث اور معاشرہ ۱۹۸۵ ، ۱۹۸۷
- میرے سرکار صلی اللہ علیہ وسلم ۱۹۸۷
- ماں باپ کے حقوق ۱۹۸۵
- اقبالؒ، قائدِ اعظمؒ اور پاکستان ۱۹۸۳ ، ۱۹۸۷
- قائدِ اعظمؒ — افکار و کردار ۱۹۸۵
- اقبال و احمد رضا، مدحت گرانِ پیغمبرؐ ۱۹۷۷ ، ۱۹۷۹ ، ۱۹۸۷
- راج دُلارے (بچوں کے لیے نظمیں) ۱۹۸۵ ، ۱۹۸۷
- ترجمہ خصائص کبریٰ (از امام جلال الدین سیوطیؒ) ۱۹۸۲
- ترجمہ فتوح الغیب (از حضرت غوثِ اعظمؒ) ۱۹۸۳
- ترجمہ تعبیر الرؤیا (امام سیرینؒ) ۱۹۸[illegible]
- نظریۂ پاکستان اور نصابی کتب (تالیف و ترجمہ) ۱۹۷۱